U15958.　　P - 19-1-10

e — FAREEZA-E-IQAMAT-E-DEEN

iu — Sadar Uddin Islahi.

Shu — Maktaba Jamaat-E-Islami./Hyderabad.
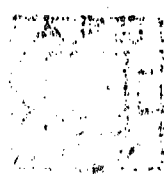
Ci —

ju — 172

Sjeib —

از
صدرالدین اصلاحی

تعداد اشاعت ایک ہزار

قیمت عہ کلدار / عہ حالی
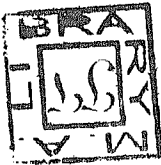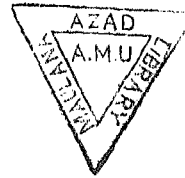
ناشر

مکتبۂ جماعتِ اسلامی

چدرگھاٹ حیدرآباد دکن

مطبوعہ

مطبع مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن

فریضۂ اقامتِ دین

کسی با اُصول جماعت کی زندگی اُس کے اُصولوں کی زندگی پر موقوف ہے۔ اگر اس کے افراد میں اِن اُصولوں کا سچا عشق اور یقین موجود ہو تو موت اُس کو آنکھ نہیں دکھا سکتی۔ یہ عشق اور یقین اس امر کی ضمانت ہے کہ وہ جماعت دنیا میں ایک غالب، سربلند اور باعزت جماعت کی حیثیت سے برپا ہو کر رہے گی۔ اور پھر اسی عشق و یقین کا فطری تقاضا یہ ہے کہ جماعت کا اجتماعی نظم و نسق اس کے اپنے ہاتھوں میں ہو، وہ ایک لمحہ کے لئے بھی اس صورتِ حال کو برداشت نہیں کر سکتی کہ کوئی ایسا اجتماعی نظم اس پر مسلط ہو جو اس کے محبوب اُصولوں پر تعمیر نہ کیا گیا ہو، اور اگر انقلابی حوادث نے اس کو کبھی یہ دن دکھا دیئے تو اس کا ایک ایک فرد اس مچھلی کی طرح بے تاب و بے قرار رہے گا جس کو پانی سے نکال کر خشکی پر ڈال دیا گیا ہو۔ اس کو اپنے اُصولوں کی محبت موت کی ساتھ کھیلنے پر مجبور کر دے گی۔ وہ رائج الوقت نظام سراپا احتجاج اور مجسم اعلانِ جنگ بن جائے گا۔ اور اس

کے تعاون یا مصالحت یا مداہنت کا تصور تک اس کے لیے ناقابلِ برداشت
ہوگا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ میری انفرادی اور اجتماعی زندگی کا تشخص انہی
اصولوں سے وابستہ ہے جن کو اس نظام قاہر نے تہ و بالا کر رکھا ہے
پھر یقین ہے کہ یہ جماعت کبھی نہ کبھی اس نظامِ غیر کے حلقۂ غلامی کو اپنی
گردن سے نکال پھینکے گی۔ اور اپنے اصولوں کا نظام زندگی قائم کرکے
دم لے گی، بشرطیکہ اس کی بہ نسبت اس کے اصول زیادہ طاقت، افادیت
اور صداقت کے حامل ہوں، اور اس کے پیروؤں کی بہ نسبت اس
کے افراد میں اپنے اصولوں کے ساتھ زیادہ گہری عقیدت اور فدویت ملتی ہو
لیکن ایک اجتماعی مسلک رکھنے والی اور با اصول جماعت
کے افراد میں اگر کسی دوسرے نظام زندگی کے ساتھ جو ان پر کسی طرح
مسلط ہو گیا ہو، تعاون یا مصالحت یا مداہنت کا رجحان پیدا ہو گیا تو
اس کا مطلب یہ ہے کہ متاعِ حیاتِ قومی کے محافظین نے خزانہ کی
کنجیاں دشمنوں کے حوالہ کر دیں۔ اور اب اس متاع کا لُٹ جانا چند لمحوں
کی بات ہے جس کو شاید کوئی معجزہ ہی بچا سکتا ہو تو بچا سکے۔
اس کے بعد ایک تیسرا دور بھی آتا ہے جس میں افراد جماعت مداہنت،
اور تعاون کی حدود سے تجاوز کرکے اس مقام پر جا پہنچتے ہیں جہاں
انہیں اپنا اصولی اور اخلاقی موقف ہی یاد نہیں رہ جاتا ہے اور وہ اپنے
اصول و مقاصد سے اتنے بیگانہ ہو جاتے ہیں کہ نہ صرف عملاً اور بطیب خاطر

بلکہ اُصولوں کی بیخ کنی پر اپنی بہترین قوتیں اور صلاحیتیں صرف
کرنے لگتے ہیں۔ بلکہ اگر کوئی واقف کار ان کی اس خود فراموشی اور
خود کشی پر اُنھیں متنبہ کرتا ہے اور یہ یاد دلانے کی کوشش کرتا ہے
کہ جن اُصولوں کے خلاف تم اس وقت صف آرا ہو، وہی تو تمہاری
رگِ حیات ہیں، تو وہ اس کی باتوں کو حیرت کے کانوں سے سنتے اور
انکار و تکذیب، طعن و تشنیع اور اختلاف و عناد کی زبانوں سے ان کا
جواب دیتے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں جماعت بحیثیت ایک اُصولی
جماعت کے فنا ہو جاتی ہے۔ اور اس کے غدار اور نالائق فرزند اپنے
ہی ہاتھوں اسے قبر کی گہرائیوں میں سلا دیتے ہیں۔

دونوں مؤخر الذکر صورتوں میں یہ ضروری نہیں ہے کہ اس
جماعت کے افراد بھی ہلاک و برباد ہو جائیں۔ اور دنیا کی دولت اور سیاست
میں ان کے لیے کوئی جگہ باقی نہ رہ جائے۔ بلکہ یہ ہر وقت ممکن ہے کہ
عام قوانینِ طبعی پر عمل کر کے وہ اقوامِ عالم کی صفوں میں ایک نمایاں
اور عظیم الشان پوزیشن کے مالک ہو جائیں۔ لیکن اپنی تمام تر شوکتوں اور
عظمتوں کے باوجود اُن اُصول و مقاصد کے نقطۂ نظر سے، جن پر اس
جماعت کی بنیاد قائم تھی، اُن کا وجود و عدم برابر ہے۔ جن اُصولوں کی
لاش ان کے پیروں تلے روندی جا رہی ہو، اُن کو اس سے کیا بحث
کہ وہ فرشِ ذلت پر ہیں یا عرشِ عظمت پر۔ ان کو اگر بحث ہے تو صرف
اس بات سے کہ زندگی کے میدان میں ہم کو قائم و برپا کرنے کی اہلیت

دلوں میں کتنی لگن ہے، اور وہ اس کے لئے اپنی جان، اپنے مال، اپنے ذرائع، اور اپنے قویٰ کے ذہنی و دماغی کی کتنی قربانیاں کر رہے ہیں، لیکن اگر یہ کچھ نہیں ہے تو یہ اصول ان سے اپنی برأت اور بے تعلقی کا اعلان کر دیں گے، اور پھر اخلاق و دیانت کا ابتدائی تقاضا یہ ہے کہ یہ لوگ بھی اپنی طرف سے انقطاع کا اظہار کر دیں۔ اب ان کے لئے یہ کسی طرح جائز نہیں ہے کہ ان اصولوں کا نام لیں اور اپنے آپ کو اس جماعتی لقب سے موسوم کریں جو ان اصولوں کی صحیح نمائندگی کے سبب انھیں ملا تھا کیونکہ اب وہ ان کے نمائندے رہے نہیں۔

اسلام بھی ایک مکمل ضابطۂ زندگی اور ایک کامل اجتماعی مسلک ہے، اور "جمعیت اسلامیہ" یا "امت مسلمہ" وہ با اصول جماعت ہے جس نے اسلام کے دیئے ہوئے اصول پر اپنی زندگی کی پوری عمارت تعمیر کی ہو، لیکن زندگی کے دوسرے ضوابط اور اسلام کے ضابطۂ حیات میں ایک فرق ہے۔ اسلام کے علاوہ دنیا میں جتنے ضوابط زندگی پیش کئے گئے ان سب کی بنیاد انسان کے دماغ کی پیداوار اور تجربات پر ہے۔ اس لئے مزید غور و فکر اور جدید تجربات اور معلومات کی روشنی میں اگر رائج الوقت ضابطۂ زندگی کے اندر کسی ترمیم کی ضرورت ہوئی تو کر لی گئی اور بعض نئے اصولوں کا اس میں پیوند لگا لیا گیا جس پر اس ضابطۂ زندگی کے پُر جوش سے پُر جوش نمائندوں اور کھرے سے کھرے عقیدت کیشوں نے کبھی کبھی ایسا اوقات کسی احتجاج کی ضرورت نہیں سمجھی۔ لیکن اسلام کا معاملہ بالکل برعکس ہے اور اس کی خوبی یہ ہے کہ

میرے اصول اور میرا پیش کردہ مسلکِ حیات کسی انسان کے ذہن و دماغ کا نتیجہ نہیں بلکہ اس علیم و خبیر کا تجویز کردہ ہے جو واقفِ اسرارِ جو بنی نوعِ انسان کی تمدنی ضروریات، فطری مطالبات اور انفرادی و اجتماعی مصالح کا صحیح اندازہ داں ہے، اور جس کی نگاہ سے انسانی فطرت کا کوئی گوشہ بھی مخفی نہیں۔ اس لیے یہ مسلکِ حیات، فطرت کے ٹھوس حقائق پر مبنی ہے، عالمگیر اور جہانی ہے، زمان و مکان کی قید اور قومی و جغرافیائی حدود سے ماورا ہے۔ غیر متبدل ہے اور انسانی علوم و افکار اور تجربات اس کی کسی ایک اصل میں بھی قطع و برید نہیں کر سکتے، اور اگر کسی نے اس مسلک کی اطاعت کا دعویٰ کرتے ہوئے بھی یہ جسارت کرنی چاہی تو اس کا شمار اس کے باغیوں میں ہے نہ کہ اطاعت کیشوں میں۔

کہا جا سکتا ہے کہ اسلام کا یہ رویّہ بہت سخت ہے، لیکن یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جو اسلام کا منکر ہو یا حقیقت اور گمان میں فرق کرنا نہ جانتا ہو، اور علمِ الٰہی کو علمِ انسانی پر قیاس کرتا ہو، اگر وہ اس امر کو تسلیم کرتا ہے کہ اسلام کے پیش کئے ہوئے اصولوں کا سرچشمہ علمِ الٰہی ہے تو اس کے کسی نقطہ میں تغیر و تبدل کی ضرورت محسوس کرنا بدترین سفاہت ہے، اور اس مسلکِ حیات کا ایک جانی دشمن بھی اگر ذرہ برابر انصاف اس کو یہ حق دینے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ ایک طرف تو وہ اسلام کی عقیدت اور پیروی کا دم بھرے اور دوسری طرف اس کے اصولوں پر عمل جراحی کرتا پھرے۔ ہاں اس کو یہ آزادی حاصل ہے کہ سرے سے اسلام ہی

کو نہ مانے اگر اس کے دعوے کی صداقت میں اس کو تردد ہو اور اس کا مسلک
زندگی اس کے نزدیک قابل ترمیم و اصلاح یا ناقابل عمل نظر آتا ہو۔

اس فرق کو ذہن نشین کر لینے کے بعد یہ بات بآسانی سمجھ میں آجاتی
ہے کہ اگر کسی با اصول جماعت کے لئے بالکل متضاد اصول اور طریقۂ
زندگی سے تعاون یا مصالحت ممکن ہو تو ہو گا، اسلام کے نام پر بننے والی
جماعت کے لئے تو کسی غیر اسلامی نظام زندگی سے مصالحت یا مداہنت
کا تصور بھی ممکن نہیں۔ لیکن زمانہ کا انقلاب دیکھئے۔ یہ جماعت بھی آج انحطاط
اور تنزل کے دھکے کھاتے کھاتے بالکل اس مقام پر پہنچ گئی ہے
جہاں اسے اپنے اجتماعی مقصد زندگی کا نام تک یاد نہیں رہا اور خود فراموشی
و خودکشی کے عبرتناک مظاہر میں سرگرم عمل ہے۔ ابتدا میں ہر با اصول زندہ جماعت کی طرح یہ جماعت بھی اپنے
اصول حیات اور مسلک زندگی کا سچا عشق و یقین اور بے مثل
جذبۂ جاں نثاری لے کر اٹھی اور اس طرح اٹھی کہ بڑی سے بڑی جانی و
مالی مصیبتیں سامنے آئیں، سخت سے سخت خطرات کا سامنا ہوا، رات کی
نیند اور دن کا سکون حرام ہو گیا۔ قید و بند اور دار و رسن کی آزمائشیں
عام ہو گئیں۔ تپتی ہوئی ریت اور دہکتے ہوئے کوئلوں کی سزائیں دی جانے
لگیں، گھر چھوڑنا پڑا۔ عزیز و اقارب سے علیحدہ ہونا پڑا، پیٹوں پر پتھر باندھ
باندھ کر بھوک کی آگ دبانی پڑی، مگر تاریخ شاہد ہے اور اس تہی دست
کی سچائی اور حقانیت کا انکار بڑے سے بڑا دشمن اسلام بھی نہیں کر سکتا
کہ ہولناک مصائب کے اس امنڈتے ہوئے طوفان میں بھی اس جماعت
نے کبھی اپنے ایک اصول کو بھی مجروح نہ ہونے دیا اور نہ وہ اپنے موقف

سے ایک اِنچ ہٹنے پر کبھی راضی ہوئی، حالانکہ اگر وہ ذرا بھی مصالحت اور مداہنت کو راہ دے دیتی تو یہ سارا ہنگامہ، مصائب سرد پڑ جاتا۔ شب و روز کی بے اطمینانی امن و سکون سے بدل جاتی، معاشی خستہ حالیاں دور ہو جاتیں اور پورا عرب اس کی سیاسی برتری کو بھی بڑی آسانی سے قبول کر لیتا جیسا کہ تاریخ بتاتی ہے اور قرآن کے اجمالی اشارات سے معلوم ہوتا ہے:۔

وَدُّوا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُونَ — وہ چاہتے ہیں کہ کاش تم ذرا مداہنت برتو تو وہ بھی مداہنت کی پالیسی اختیار کریں۔

لیکن اس کے پیرو جانتے تھے کہ یہ مداہنت تحریک کی موت ہوگی۔ اور اپنے اصولوں کو چھوڑنے کے بعد ہمارا وجود، اپنے مقصد کے لحاظ سے، بے معنی ہو کر رہ جائے گا۔ اُدھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی بار بار تنبیہ آتی رہتی تھی کہ:۔

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ ۔۔۔۔۔۔ وَأَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ أَنْ يَفْتِنُوكَ عَنْ بَعْضِ مَا أَنْزَلَ اللّٰهُ إِلَيْكَ ۔۔۔۔ (مائدہ ۱۰)	پس اے پیغمبر! ان کے درمیان اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ کرو اور اس حق کو چھوڑ کر جو تمہارے پاس آیا ہے، ان کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔۔۔۔۔۔ اور ان کے معاملات میں اس قانون کے مطابق فیصلہ کرو جس کو اللہ نے نازل فرمایا ہے۔ اور ان کی خواہشاتِ نفس کا لحاظ نہ کرو۔

فریضۂ اقامتِ دین

اور دیکھو ہوشیار رہو کہ کہیں یہ لوگ تم کو اس ہدایت اور
ان قوانینِ ہدایت سے ذرہ برابر بھی برگشتہ
کر کے فتنہ میں نہ ڈال دیں جن کو اللہ نے
تم پر نازل کیا ہے۔

اس لیے اس جماعت کے رہنما، اور پیکرِ عزم و یقین پیرو، سب کے
سب آگ و خون کے طوفان میں بھی اپنے مرکز پر جمے رہے، اور حالات
کی کوئی ناسازگاری یا مصلحت انھیں اپنے مسلک سے یک سرِ مو بھی نہ
ہٹا سکی، اور نہ اپنے اصول کے بارے میں انھوں نے وقتی طور پر بھی
مداہنت سے کام لیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے تمام ہنگامی مسائل
مادی مصالح، ظاہری تدابیر اور دنیوی مفاد سے آنکھیں بند کر لی ہیں، اور
ایک جنون ہے جس نے انھیں "عقل و دانش" کا دشمن بنا ڈالا ہے، چنانچہ
اس زمانہ کے سیاست دانوں اور مدبروں کا متفقہ فیصلہ بھی ان کے بارے
میں یہی تھا کہ غَرَّ هٰٓؤُلَآءِ دِيْنُهُمْ (انھیں ان کے دین نے فریب میں مبتلا کر رکھا ہے)
مگر جلد ہی دنیا نے اس "خود فریبی" کا انجام دیکھ لیا، اور سیاساتِ عالم
میں وہ انقلاب آیا جس کی منطقی توجیہ کرنے میں عروج و زوالِ امم کے نکتہ دانوں
کی عقلیں دنگ ہیں۔ جن کو اپنے گھروں میں بھی سر چھپانے کی جگہ نہ ملتی تھی
قیصر و کسریٰ کے تاج و تخت ان کے قدموں میں آ پڑے، اور پوری ایک صدی
بھی گزرنے نہ پائی تھی کہ وہ یورپ، ایشیا اور افریقہ کے براعظموں کے بیشتر
حصوں پر چھا گئے۔ اور یہ سب کچھ اس یقین و اذعان اور وفاداری و

فداکاری کے طفیل سہا جوان کے دلوں میں اپنے اصول و مقاصد کے لئے موجود تھی، اور جس نے انھیں اپنے مسلک زندگی کے لئے جینا اور مرنا سکھا دیا تھا۔

اس کے بعد اس جماعت پر وہ دور آیا جب اس کے افراد کے ذہنوں میں اصول و مقاصد کے نقوش ماند پڑنے لگے۔ اور مختلف خارجی اسباب کے باعث ان کے اندر مداہنت کی بیاری جڑ پکڑنے لگی جو امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ ترقی کرتی گئی، غیر اسلامی اصول و نظریات مسلمانوں میں کثرت سے پھیلنے لگے جن کی روک تھام کے لئے علمار حق کی طرف سے بہتری کوششیں بھی ہوتی رہیں، مگر ناتربیت یافتہ عوام الناس کی خام مذہبیت اور حکومتوں کی فرض ناشناسی نے ان کوششوں کو پوری طرح کامیاب نہ ہونے دیا اور یہ بیماری آہستہ آہستہ اسلامی اصول کی جڑیں کھوکھلی کرتی رہی۔ لیکن جب تک اس جماعت کا سیاسی اقتدار قائم رہا، ان اصولوں کے بارے میں اس نے بحیثیت مجموعی خود فراموشی اور خودکشی کی راہ نہیں اختیار کی۔ لیکن جیسا کہ اوپر عرض کیا جا چکا ہے، یہ مداہنت اور مصالحت کی پالیسی بجائے خود موت کا پیش خیمہ ہے۔ جس سرچشمہ سے جماعت کی سیاسی طاقت کو غذا ملتی تھی، جب اس سے اس نے اعراض برتنا شروع کیا تو اس کا لازمی نتیجہ سیاسی زوال کی شکل میں نمودار ہوا۔ جس کے بعد ہی اس پر تنزل اور انحطاط کا آخری دور شروع ہو گیا اور آہستہ آہستہ اب وہ وقت آن پہونچا ہے کہ یہ جماعت اپنے آپ کو پہچانتی بھی نہیں، اس کے

افراد کی غالب ترین اکثریت اپنے اصول و مقاصد، اپنے مسالک اور اپنے
وجود کی غرض و غایت کو اس طرح فراموش کر چکی ہے کہ اگر ان چیزوں
کو اس کے سامنے رکھا جائے تو نہ صرف ان سے اجنبیت اور بیگانگت
محسوس کرتی ہے بلکہ پوری طمانیت قلب اور ادعائے تحقیق کے ساتھ
اس کو غیر اسلام ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہے، اور جو چیزیں ان اصولوں
کی عین ضد ہے اس کو اسلام کا منتہائے مقصود قرار دینے پر مصر ہے۔ نتیجہ
یہ ہے کہ اس کی تمام تر جد و جہد اپنے ہی مقصدِ حیات کی پامالی پر مرکوز ہے
اور خوش فہمی یہ ہے کہ یہ اسلام اور جماعت مسلمین کی سرفرازی کا باعث
ہوگا۔ وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا۔

ایک تھوڑی سی تعداد ایسے لوگوں کی بھی اس جماعت میں موجود
ہے جو خود فراموشی اور خودکشی کے اس مقام تک ابھی نہیں پہنچی ہے
اس کی نگاہ اپنے نصب العین کے جلووں سے ابھی تک آشنا ہے
وہ اسلام کے اصول و مقاصد کی یاد اپنے سینوں میں دبائے ہوئے ہے
مگر یہ یاد محض ایک "متبرک یادگار" بن کر رہ گئی ہے جس میں زندگی کی حرارت
یا تو مفقود ہو چکی ہے یا اتنی خفیف کہ محسوس نہیں ہوتی۔ الا ماشاء اللہ
حالات کی ناسازگاری، مخالف قوتوں کی قہاری اور ماحول کی نامساعدت
نے سروں میں وہ سودا باقی نہیں رہنے دیا جس کے بغیر کسی اصول یا
مقصد کا نام لینا ہی حرام ہے۔ ان لوگوں نے مداہنت اور مصلحت کی
پُرامن روش اختیار کر رکھی ہے، اور اس امر کی پوری احتیاط کرتے ہیں

کہ کہیں ان پر سیاست و تدبر کی زبان سے عَزَّهُمْ لِاَهْلِ دِيْنِهِمْ کی پھبتی نہ کس دی جائے۔

اِن حالات میں یہ جماعت اگر دنیوی جاہ و اقبال کی مالک ہوتی تو بھی اسلام کو اس سے کوئی بحث اور دلچسپی نہ ہوتی، اور نہ اس کا مجرد سیاسی اقتدار اس کی نظروں میں کوئی وقعت رکھتا، اس کو تو جو کچھ بحث و دلچسپی ہے صرف اپنے نصب العین کی اقامت سے ہے۔ اس نصب العین کو پس پشت ڈال کر اگر اس کے نام لینے والوں نے دولتِ کونین بھی حاصل کر لی تو اس کے کس کام کی؟ مگر بدقسمتی سے یہ چیز بھی آج اس جماعت کو حاصل نہیں۔ اس نے اپنے اصولِ زندگی کو ترک اور فراموش کر کے جو کچھ پایا وہ ذلت اور محکومی کا وہ داغ ہے جو ہر جماعت کی پیشانی پر تو لگ سکتا ہے مگر سلطانِ کائنات کی پارٹی — حزب اللہ — کی پیشانی پر کبھی نہیں لگ سکتا۔

قرآنی فلسفۂ عروج و زوالِ امم

یہاں ایک ایسا سوال پیدا ہوتا ہے جو آجکل عام مسلمانوں کے ذہنوں میں بار بار کھٹکتا اور ان کے لیے بڑی حیرانی کا باعث بنا ہوا ہے۔ وہ رہ رہ کر یہ سوچتے ہیں کہ آخر ہماری موجودہ زبوں حالی کا سبب کیا ہے؟ یہ ہمیں تسلیم ہے کہ ہم بدعمل ہو گئے ہیں، ہمارے ایمان میں کمزوری آگئی ہے۔ ہمارے اخلاق تباہ ہو چکے ہیں۔ ہم احکامِ دین سے غافل ہیں۔ یہ سب کچھ صحیح مگر پھر بھی ہم ہی توحید کے تنہا علمبردار ہیں، ہم اگر اپنے سر جھکاتے ہیں تو خدا ہی کے سامنے جھکاتے ہیں، اس کے رسول

کا حلقۂ اطاعت ہے تو صرف ہماری گردن میں ہے۔ اس کے احکام پر اگر کچھ عمل کرتے ہیں تو ہم ہی کرتے ہیں — اور ہمارے بالمقابل ساری دنیا کافر و مشرک ہے۔ خدا کی باغی اور توحید کی منکر ہے۔ رسول کی مخالف اور قرآن کی دشمن ہے۔ پھر یہ کیا بات ہے کہ ہم پست وہ سربلند، ہم مفلس اور وہ دولتمند، ہم ذلیل و خوار اور وہ صاحبِ اقتدار۔ ہم غلام و محکوم اور وہ آزاد و حکمران۔ حالانکہ ہم بہرحال غیروں کی بہ نسبت اللہ سے زیادہ قریب ہیں۔ اس لیے ان کے مقابلہ میں ان الٰہی انعامات کے ہم زیادہ مستحق تھے نہ کہ وہ!

یہ سوال عروج و زوالِ امم کے اس فلسفہ سے ناواقفیت کی بنا پر پیدا ہوتا ہے جس کو قرآن حکیم نے بیان فرمایا ہے، ورنہ طبعی اور اخلاقی[1] دونوں حیثیتوں سے ہم ٹھیک اسی مقام پر ہیں جہاں ہونا چاہیے تھا۔ اس کشمکشِ حیات میں دو قسم کے قوانین مصروفِ عمل ہیں، ایک تو قوانینِ طبعی دوسرے قوانینِ اخلاقی۔ قوموں کے ابھارنے اور بگاڑنے میں یہ دونوں

---

[1] اخلاق سے ہماری مراد قرآنی اور دینی اخلاق ہیں نہ کہ افادی اور تجربی اخلاق، ورنہ افادی اور تجربی اخلاق سے عاری ہو کر محض قوانینِ طبعی کے بل پر بھی کوئی قوم فتح و غلبہ نہیں حاصل کر سکتی۔ یہاں ہم نے افادی اور تجربی اخلاق کو بھی قوانینِ طبعی کے ضمن میں شمار کیا ہے کیونکہ یہاں عام اقوام کے عروج و زوال سے ہم بحث نہیں کر رہے ہیں بلکہ امتِ مؤمنہ کے عروج و زوال تک یہ بحث محدود ہے۔

ہی قسم کے قوانین کام کرتے ہیں، مگر دونوں میں ایک فرق ہے، اور وہ یہ کہ تنہا قوانین طبعی ایک قوم کو میدان مقابلہ میں فتح و غلبہ دلا سکتے ہیں لیکن قوانین اخلاقی میں قدرت نے یہ قوت نہیں رکھی کہ وہ تنہا کسی قوم کو اٹھا کر تخت سلطانی پر بٹھا دیں۔ قوانین اخلاقی کو قوموں کی باہمی کشمکش اور جنگی معرکوں میں "خصوصی اختیار (Veto Power) کی حیثیت حاصل ہے۔ یعنی اگر دونوں فریق جنگ صرف مادی تیاریوں کے ساتھ برسرِ پیکار ہوں تو فتح اُس کی ہوگی جو زیادہ اسباب و ذرائع جنگ کے ساتھ میدانِ مقابلہ میں آیا ہوگا اور اگر ایک طرف مادی قوتیں ہوں، اور دوسری طرف محض اخلاقی اور روحانی قوتیں ہوں تو فریق ثانی کا شکست کھانا یقینی ہے۔ لیکن اگر مادی قوتوں اور اسباب و ذرائع کے اعتبار سے دونوں فریق برابر ہوں مگر ساتھ ہی ایک فریق اخلاقی آلات سے بھی مسلح ہے تو اس کا غالب ہونا بھی یقینی ہے بلکہ قرآنی تصریحات تو یہ بتاتی ہیں کہ اگر مادی وسائل کے اعتبار سے وہ فروتر بھی ہو، حتیٰ کہ اگر فریق مخالف کا دسواں حصہ ہو تو بھی اللہ تعالیٰ کی غیبی اور مافوق الفطری اعانتیں اس کو کامرانی اور فتح مندی سے ہمکنار کر دیتی ہیں۔ لیکن شرط یہی ہے کہ ایک طرف تو اس نے اپنے امکان اور مقدور بھر مادی وسائل اور تدابیر سے کام لینے میں دریغ نہ کیا ہو۔ اور دوسری طرف قرآنی مطالبات کے مطابق اپنے ایمان کو راسخ اور اعمال کو صالح بنا لیا ہو۔ یعنی یہ کہ اس میں اپنے اصولوں کا حقیقی عشق اور اپنے مسلکِ زندگی کا زندہ جنون موجود ہو۔ تائیدِ غیبی اور اعانت مافوق الفطری

کا یہی وعدہ ہے جو قرآن کی ان آیات میں کیا گیا ہے:

(۱) وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَبَقُوا ۚ إِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُونَ (انفال-۸۰) — اور کافر ہرگز یہ گمان نہ کریں کہ وہ بازی لے گئے نہیں وہ ہم کو عاجز نہ کر سکیں گے۔

(۲) كَم مِّن فِئَةٍ قَلِيلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ. — کتنی ہی چھوٹی جماعتیں بڑی جماعتوں پر بحکم خدا غالب ہوئی ہیں۔

(۳) يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللَّهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ (انفال) — اے نبی تمہارے لئے اللہ کافی ہے، اور تمہارے پیرو مسلمانوں کے لئے۔

(۴) وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ (آل عمران ۱۴) — نہ سست پڑو اور نہ غمگین ہو، تم ہی غالب رہو گے بشرطیکہ تم مومن ہو۔

(۵) إِنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ — یقیناً زمین کے وارث میرے صالح بندے ہی ہوں گے۔

(۶) وَمَن يَتَوَلَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالَّذِينَ آمَنُوا فَإِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْغَالِبُونَ (مائدہ-۸) — اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول اور مومنوں کو اپنا ساتھی بنائے گا (وہ بامراد اور سربلند ہوگا) کیونکہ اللہ ہی کی جماعت غالب رہنے والی ہے

اس اعانتِ غیبی کے ظہور کی مثالیں ہر دور میں پائی جا سکتی ہیں، خود اس اُمت کی ابتدائی تاریخ اس قسم کے واقعات سے بھری ہوئی ہے بدر و اُحد اور احزاب و حُنین کے معرکوں میں خدا کی "نصرت اور فتح" سے

جو کچھ کیا اُس پر قرآن تک کی شہادت موجود ہے جس کا انکار کرنے کے لیے پہلے قرآن کا انکار کر لینا ضروری ہے۔

نعمت بہ قدر حکمت | لیکن جہاں اس جماعت کو قدرت کی یہ مخصوص نظرِ عنایت حاصل ہے، وہیں اس کی ذمہ داریاں بھی بہت نازک ہیں اور اس کو اس وعدۂ خاص کے ساتھ ایک وعید خاص بھی سنا دی گئی ہے جس کی طرف سے اس نے اپنے کان بند کر لیے ہیں، لیکن یہی کان بند کر لینا اس کے لئے بڑی غلط فہمیوں اور ہلاکتوں کا باعث بن گیا اور وہ سوال پیدا کر گیا ہے جس کو ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں۔ قرآن نے اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور نعمتوں، اس کی محبوبیت اور مخصوصیت، اور اس کی جزا و سزا کا یہ قانون بیان فرمایا ہے کہ جس فرد یا گروہ پر اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم جتنا ہی زیادہ ہوتا ہے، اس فضل و کرم کی ناشکری اور احکامِ الٰہی سے بغاوت کے وقت اس کی گرفت بھی اتنی ہی زیادہ سخت اور ہولناک ہوتی ہے۔ اور محکومی و نامرادی کی جو سزا وہ دوسری قوموں کو برے اعمال کی پاداش میں دیا کرتا ہے، اتنے ہی بُرے اعمال کے ارتکاب پر اس قوم کو اس سے دوگنی یا کئی گنی سزائیں دیتا ہے جو اس کے انعامات سے سرفراز ہو۔ اس آسمان کے نیچے اللہ تعالیٰ کا سب سے زیادہ محبوب اور مقرب بندہ جو عالمِ وجود میں آیا وہ محمد رسول اللہ صلعم تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ان انعامات سے نوازا جو کسی کو بھی نصیب نہ ہوئے اور جن پر اس نے اپنی نعمت کی تکمیل کر دی۔ مگر ساتھ ہی انھیں یہ بات بھی سنا دی گئی تھی کہ :

وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا (بنی اسرائیل ۴)

اگر ہم تم کو (حق پر) ثابت قدم نہ رکھتے تو قریب تھا کہ تم ان کفار کی طرف کچھ نہ کچھ جھک پڑتے (اگر ایسا ہوتا تو) یقیناً ہم اس وقت تم کو زندگی اور موت دونوں میں (یعنی دونوں جہان میں) دوہرا عذاب چکھاتے۔ پھر تم ہمارے مقابل کسی کو اپنا مددگار نہ پاتے۔

ازواج مطہرات کو جہاں یہ رتبہ بخشا گیا تھا کہ وہ امہات المومنین ہیں اور ان کی حیثیت عام عورتوں جیسی نہیں ہے (يٰنِسَاۗءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَاۗءِ) اور یہ کہ اگر وہ اللہ اور اس کے رسول کی صدق دل سے تابعداری کریں اور اچھے کام کریں تو عام لوگوں کی بہ نسبت ان کو دوگنا اجر ملے گا۔ (وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَآ اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ وَاَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيْمًا (احزاب ۳)) وہیں اس حقیقت سے بھی آگاہ کر دیا گیا تھا کہ:

يٰنِسَاۗءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ (احزاب ۳)

اے نبی کی بیویو! تم میں سے جو کوئی کسی کھلی ہوئی بے حیائی کی مرتکب ہوگی اس کو دوگنا عذاب دیا جائے گا۔

یہودی قوم وہ قوم ہے جس پر انعامات الٰہی کی بارش ہوتی رہی جس کو دشمن سے بچانے کے لیے سمندر خشک کر دیا گیا جس کی معاشی مشکلات کے وقت من وسلویٰ کا نزول ہوتا رہا، اور بقول بائبل، جس نے بیابان نوردی

کے وقت خود خدا وند عالم بدلیوں کی شکل میں اس پر سایہ کرتا ہوا چلتا، اور جس کو بقول قرآن، تمام اقوامِ عالم پر فضیلت دی گئی تھی لیکن جب اسی محبوب اور لاڈلی قوم نے اپنے عہد کو فراموش کر دیا، اپنی ذمہ داریوں کو پس پشت ڈال دیا، احکامِ الٰہی سے سرتابی کر بیٹھی اور فسق و فجور میں غرق ہو گئی تو اس پر اللہ کا غضب اس طرح ٹوٹ پڑا جس کی نظیر پیش کرنے سے پوری تاریخِ انسانی قاصر ہے، جتنی یہ قوم سربلند تھی اتنی ہی ذلیل ہو گئی، جس قدر محبوب تھی اُسی قدر مغضوب ہو گئی۔

غرض یہ اللہ تعالیٰ کی ایک نہ بدلنے والی سنت ہے کہ اس کی "نقمت بقدر رحمت" ہوا کرتی ہے اور یہ سنّت بالکل مطابقِ فطرت ہے ہم ایک اجنبی سے اس حسنِ سلوک کے امیدوار نہیں ہوتے جس کی امید ہمیں اپنے اعزہ سے ہوتی ہے۔ ایک غیر شخص اگر ہماری باتوں کو نہیں مانتا یا اس کی تکذیب اور مخالفت کرتا ہے تو ہم اس پر زیادہ رنجیدہ یا مشتعل نہیں ہوتے۔ لیکن یہی بات اگر اپنے کسی نمک خوار غلام، یا ناز پروردہ بیٹے کی طرف سے وجود میں آئے تو اس وقت ہمارے غم و غصہ کی انتہا نہیں رہتی۔ اور ہم اس کی اس حرکت کا وہ جواب دیتے ہیں جو ایک غیر آدمی کو کبھی نہیں دے سکتے۔ کیونکہ غیر کی مخالفت کا مطلب زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ وہ ایک سچی بات کا منکر اور دشمن ہے، لیکن اس یگانے کی مخالفت کا مطلب یہ ہے کہ اس میں مخالفتِ حق کے ساتھ ساتھ نمک حرامی بھی ہے۔ جو ضمیرِ انسانی کی سب سے بڑی اور گھناؤنی رذالت ہے۔ بالکل یہی اصول

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے بارے میں برتتا ہے اور ان افراد یا اقوام کو جو اس کی عنایات اور انعامات کا مورد ہونے کے باوجود، اس کے احکام کی مخالفت پر اتر آتی ہیں، عام حالات کی بہ نسبت دوگنی سزائیں دیتا ہے کیونکہ وہ بیک وقت دو جرموں کی مرتکب ہوتی ہیں، ایک تو مخالفت حق کی، دوسرے نمک حرامی کی۔

ہماری موجودہ حالت

امت مسلمہ کو اسی سنت الٰہی کی روشنی میں اپنے ماضی اور حال کا جائزہ لینا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کا اس امت کے ساتھ کیا معاملہ رہا ہے؟ کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ اس نے اس امت کو وہ ساری نعمتیں بخشیں جو اس سے پہلے دوسری تمام اقوام کو دی گئی تھیں، اور اس کے علاوہ وہ نعمتیں بھی جو اب تک کسی قوم کو نہیں ملی تھیں؟ آخر یہ سارے عالم کی امامت کا منصب[1] اور خیر الامم کا خطاب[2]، یہ امت وسط اور شہداء علی الناس کے القاب[3]، یہ اکمال دین[4] اور اتمام نعمت کے انعامات اس سے پہلے کبھی کسی امت کو ملے تھے؟

[1،2] كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ الخ (تم وہ بہترین امت ہو جو تمام لوگوں (کی امامت و رہنمائی) کے لیے معرض وجود میں لائی گئی ہے۔ تم کو نیکی کا حکم دینا چاہیے)

[3] وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ (اور اسی طرح ہم نے تم کو ایک عادل اور درمیانی امت بنایا کہ تم سب لوگوں کے لیے حق کے گواہ بنو۔)

[4] أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي (آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمتیں تمام کر دیں)

یقیناً نہیں، پھر غور کیجیے کہ اس امت کی ذمہ داریاں کتنی بھاری ہیں، اور ان ذمہ داریوں کو پس پشت ڈال لینے کے نتائج کتنے خطرناک ہو سکتے ہیں جو قانون خداوندی اپنے محبوب پیغمبر اور اس کی محترم ازواج کے لئے اس طرح تیغ بے نیام تھا وہ دوسروں کے بارے میں کب کوئی نرمی دکھا سکتا ہے پس یہ امت آج اپنے کو جس حال میں پا رہی ہے وہ اسی اصول کے مطابق ہے۔ اس کو اللہ تعالیٰ نے ایک نصب العین اور ایک ضابطۂ حیات عطا فرمایا تھا۔ اس ضابطہ کا نام دین الحق ہے اور اس کی تفصیلات کے مجموعہ کا نام قرآن ہے۔ یہ قرآن اپنے کو اس میثاق کی دستاویز قرار دیتا ہے جو اللہ نے اپنے بندوں سے لیا ہے اور جس کی پابندی کا ہر مسلمان نے اپنے رب سے معاہدہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس میثاق کو بندوں کے لیے ایک نعمت قرار دے کر اور یہ بتا کر کہ تمہاری کامیابی و ناکامی کا انحصار اسی میثاق کی پابندی پر ہے، فرمایا ہے کہ:

وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُم بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (مائدہ ۲.)

اور اللہ نے تم کو جو نعمت عطا کی ہے اس کو یاد رکھو اور اس میثاق کو نہ بھولو جس کو اس نے تم سے باندھا ہے، جبکہ تم نے کہا تھا کہ ہم نے سنا اور مانا۔

تمام احکام قرآنی اس معاہدۂ عبد و معبود کی دفعات ہیں جن میں سے ہر ایک کے متعلق حکم ہے کہ اس کو پورا کیا جائے اور ہر حال میں ٹھیک ٹھیک اس کی پابندی کی جائے (یا ایہا الذین آمنوا اوفوا بالعقود) اے

ایمان لانے والو! اپنے عہدوں کو پورا کرو) پھر ایک جامع ہدایت یہ کر دیگئی کہ

اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ	تمہارے رب کی طرف سے جو کچھ نازل ہوا
وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ	اسی کی پیروی کرو، اور اس کو چھوڑ کر (دوسرے
(اعراف۱)	جھوٹے) خداوندوں کا اتباع نہ کرو۔ (خواہ یہ خداوندان اصنام ہوں، خواہ احبار و ملوک خواہ آباؤ اجداد ہوں خواہ اپنا نفس)

قرآن کے اس مطالبہ کو سننے کے بعد دو ہی راہیں اختیار کی جاسکتی ہیں، یا تو اس کا انکار کر دیا جائے یا پھر غیر مشروط طریقہ پر سر تسلیم خم کر دیا جائے اور ہر اُس پابندی کو عملاً قبول کر لیا جائے جو رب کائنات کی طرف سے نازل اور عائد کی گئی ہو ایک معمولی سمجھ کا آدمی بھی اس واضح حقیقت کے ادراک سے عاجز نہیں رہ سکتا، اس لئے وہ شخص بدترین جہالت اور سفاہت کا ثبوت دیگا جو بعض پابندیوں کو تو مانے اور بعض سے گریز کرے یہ پوزیشن عقل انسانی کے نزدیک بھی بالکل مضحکہ خیز اور ناقابل تسلیم ہے اور قرآن کے نزدیک بھی. چنانچہ قرآن اپنے اس مطالبہ کے ساتھ ہی ان لوگوں کو، جو یہ بین بین کی روش اختیار کرتے ہیں، اِن لفظوں میں زجر و ملامت کرتا اور اس کے خوفناک نتائج سے یوں متنبہ کرتا ہے:-

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ	کیا تم کتاب الٰہی کی بعض باتوں کو مانتے ہو
تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَآءُ مَنْ	اور بعض کو نہیں مانتے؟ سو ایسا کرنے
يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ	والوں کی سزا اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ

فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَیَوْمَ الْقِیٰمَۃِ	دنیا میں ذلیل و خوار ہوں اور آخرت میں
یُرَدُّوْنَ اِلٰٓی اَشَدِّ الْعَذَابِ	ایسے لوگوں کو شدید ترین عذاب کی
وَمَا اللّٰہُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ	طرف پھیر دیا جائیگا۔ اللہ تمہارے اعمال
(البقرہ ۱۰)	سے غافل نہیں ہے۔

بنی اسرائیل کی تاریخ اس قانونِ جزا کی زندہ شہادت ہے۔ ان کو خدا نے ایک کتاب دی تھی، اور اس لیے دی تھی تاکہ اس کے احکام کی پابندی کریں، اور اس کے بتائے ہوئے طریقہ پر اپنی زندگی کا نظام چلائیں مگر انہوں نے اس کتاب کے ساتھ سلوک یہ کیا کہ ایک طرف تو اس میں تحریف کرنے لگے۔ دوسری طرف جو کچھ بھی اصل تعلیم باقی رکھ چھوڑی تھی اس کے بھی ایک بڑے حصہ کو اپنی دنیائے عمل سے خارج کر دیا۔ جیسا کہ قرآن بتاتا ہے:

یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِہٖ	یہ لوگ الفاظ کا اُلٹ پھیر کر کے بات
وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُکِّرُوْا بِہٖ	کہیں سے کہیں لے جاتے ہیں، اور جو تعلیم
(مائدہ ۳)	اُنہیں دی گئی تھی اسکا ایک حصہ بھلا چکے ہیں

"بھلا دینے" کا یہ مطلب نہیں کہ کتاب کا یہ حصہ اُن کے حافظے سے محو ہو گیا تھا، نہیں، وہ تو تحریری شکل میں موجود تھا، اور کتاب الٰہی ہدایت حاصل کرنے کے لئے آتی ہے، نہ کہ حفظ کرنے کے لئے۔ سو اصل مقصود اس کتاب سے وہ بخوبی حاصل کر سکتے تھے لیکن اس کتاب کے اجارہ دار فریسیوں نے کیا یہ کہ مختلف سیاسی، معاشی اور دوسری اغراض و مصالح کے

پیشِ نظر بہت سے احکام کو معطل کر دیا، کتنے ہی قوانین تھے جن کو فاسق افراد کی خاطر بدل کر نرم بنا ڈالا، اور کتنی ہی آیتیں تھیں جن کے مطالب و مقتضیات کو دوسروں سے چھپا کر رکھتے اور معاملاتِ زندگی میں ان کو پیش آنے ہی نہ دیتے۔ قرآن مجید نے ان کی اسی مجرمانہ حرکت کا اعلان کیا جب اس نے کہا:

... تَجْعَلُونَهُ قَرَاطِيسَ تُبْدُونَهَا وَتُخْفُونَ كَثِيرًا (الانعام ۹۱)

جس (توراۃ) کو تم متفرق اوراق میں رکھ کر لوگوں کو دکھاتے ہو اور اُس کے مطالب و احکام کا بڑا حصہ چھپا جاتے ہو۔

پھر اسی چیز کو ایک دوسرے انداز میں یوں کہا گیا:

وَإِذْ أَخَذَ اللّٰهُ مِيثَاقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَتُبَيِّنُنَّهُ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُونَهُ فَنَبَذُوهُ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا (آل عمران ۱۸۷)

اور یاد دلاؤ اُس وقت کو جب اللہ نے اہلِ کتاب سے عہد لیا تھا کہ تمہیں اس کتاب کو لوگوں کے سامنے کھول کھول کر بیان کرنا ہوگا اور اسے چھپا کر نہ رکھنا، مگر انہوں نے اس کو پسِ پشت ڈال دیا اور تھوڑی سی قیمت پر اسے بیچ ڈالا۔

”پسِ پشت ڈال دیا“ کے الفاظ بتاتے ہیں کہ اللہ کی کتاب ان کے پاس موجود تھی مگر جب زندگی کے معاملات سامنے آتے تو اُس سے رہنمائی حاصل کرنے کی بجائے جزدانوں میں لپیٹ کر کہیں حفاظت سے رکھے رہتے۔ کتابِ الٰہی کے ساتھ ان کا یہی طرزِ عمل تھا جس کو [illegible] کے جامع الفاظ میں بیان کیا گیا ہے اور جس کی عملی تفسیر یہود کے

ان کے اخلاقی جرائم اور شیطانی اعمال سے ہوتی ہے جن کی تفصیل سے قرآن بھرا پڑا ہے۔ گویا عملی طور پر وہ توراۃ کے ایک حصہ کا انکار کر رہے تھے۔ جس کا انجام اس ذلت اور مسکنت کی صورت میں نمودار ہوا جو "خِزْیٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا" کی سب سے نمایاں مثال ہے:

غرض قرآن کا مطالبہ کامل حوالگی کا ہے، یعنی جو کچھ بھی وہ کہے اس پر اور صرف اسی پر عمل ہونا چاہیے، اس نے اپنے متبعین کے لیے جو حدیں زندگی کے مختلف شعبہ جات میں قائم کر دی ہیں۔ ان سے آگے قدم اٹھانے کی سرے سے کوئی گنجائش نہیں۔ ایسا کرنے والوں کو وہ ظالم قرار دیتا ہے۔ وَمَنْ یَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰہِ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الظّٰلِمُوْنَ۔ اس لئے قرآن پر ایمان لانے اور مسلم ہونے کا مطلب یہ ہوا کہ اس کے اندر جو کچھ ہے اس کو یا اس کے کسی ادنیٰ سے ادنیٰ جزو کو کبھی ترک نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن آج صورت واقعہ کیا ہے؟ دماغ کو تمام خارجی تاثرات سے آزاد کر کے مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکُمْ مِّنْ رَّبِّکُمْ پر اول سے آخر تک نظر ڈال جائیے اور اس کے بعد اپنی روزمرہ کی زندگی کا گہرا جائزہ لیجئے اور پھر اندازہ کیجئے کہ قرآن کے کتنے احکام پر عمل ہو رہا ہے؟ چھوڑ دیجئے ان لوگوں کو جو "مسلمان" ہوتے ہوئے بھی اسلام کے علانیہ باغی اور اس کے اصولوں کی سچائی کے منکر ہیں یا جن کی زندگی کے لمحات ایک ایک کر کے اسلامی قوانین کے توڑنے اور ہوائے نفس کے اتباع میں صرف ہوتے رہتے ہیں اور جن کو فقہی اصطلاح میں فاسق و فاجر کہا جاتا ہے۔ ان افراد اور حلقوں کی طرف نگاہ دوڑائیے جو نیکی اور تقویٰ اور ایمان

وعمل کے لحاظ سے مردانِ کامل کہے جاتے ہیں۔ یہاں بھی آپ کو جو کچھ دکھائی دے سکتا ہے وہ زیادہ سے زیادہ یہی ہوگا کہ ان لوگوں کی زندگی ان احکام الٰہی کے ماتحت ہے جن کا تعلق انفرادی زندگی سے ہے۔ نماز اور روزوں کی پوری پوری پابندی ہوتی ہے، اوراد و وظائف کی کثرت ہے، زکوٰۃ و صدقات بھی ادا ہورہے ہیں، جھوٹ، غیبت، بدگوئی اور بہتان تراشی سے زبان آلودہ نہیں ہونے پاتی۔ کبر و غرور، نمود و ریا، خیانت و بدعہدی، ظلم و غصب، رشوت و حرام خوری اور فتنہ و فساد کے دھبوں سے ان کے ایمان کا دامن پاک رہتا ہے۔ باقی رہے اجتماعی احکام و مسائل، سو یہاں بھی ان سے غفلت و بے اعتنائی کا وہی حال ہے جو "غیر متقی" حلقوں میں نظر آتا ہے۔ قرآن نے اگر زندگی کے صرف انفرادی پہلو سے ہی بحث کی ہوتی تب تو بلا شبہ اسطرح اتباع قرآن کا حق ادا ہوجاتا مگر وہ تو زندگی کے اجتماعی مسائل کو بھی اتنی ہی اہمیت کے ساتھ لیتا ہے جتنی اہمیت سے انفرادی مسائل کو۔ اس نے نماز، روزے، حج اور زکوٰۃ کے فرائض ادا کرنے، اور دیانت، امانت، اخلاص، وفائے عہد، حسنِ سلوک، اکل حلال اور صدق مقال وغیرہ اخلاق فاضلہ پر کاربند ہونے کی ہدایتیں دینے کے ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی بھی عبادت کے لائق اور حاکمیت و فرمانروائی کا مستحق نہیں۔ اس لیے اسی کو اپنا آقا اور سلطان مانو۔ (اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ، اَلَا لَہُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ) (اَنِ اعْبُدُوا اللّٰہَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوْتَ) خدا ہی کی بندگی کرو اور تمام باطل معبودوں کو چھوڑ دو۔) خدائی اور فرمانروائی کے ان تمام جھوٹے مدعیوں کے دعاوے تسلیم کرنے سے انکار کردو جو خدا کی بادشاہت کے باغی ہوکر اس کی رعایا پر اپنا حکم چلانا چاہتے ہیں۔ (وَقَدْ اُمِرُوْا اَنْ یَّکْفُرُوْا بِہٖ)

اِن لوگوں کا کہا نہ مانو جو اللہ کے حقوق سے غافل اور اس کی حدود کو توڑنے والے ہیں۔ (وَلَا تُطِيعُوا أَمْرَ الْمُسْرِفِينَ) جب فیصلہ کرو تو احکامِ الٰہی کے مطابق کرو۔ (فَاحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ) اور جب اپنا فیصلہ کراؤ تو انہی احکام کے ماتحت کراؤ، ورنہ غیر الٰہی قوانین کی عدالت میں اپنا معاملہ لے جانے والا منافق ہے (يُرِيدُونَ أَنْ يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ) اور قوانینِ الٰہی کو چھوڑ کر ان قوانین کے مطابق فیصلہ کرنے والا ظالم، فاسق اور کافر ہے۔ (وَمَنْ لَمْ يَحْكُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ .... الْفَاسِقُونَ ...... الْكَافِرُونَ) کسی برائی، کسی ظلم، اور کسی عدوان کے پروان چڑھانے میں کسی طرح کا تعاون نہ کرو۔ (لَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ) کفر کے علمبرداروں سے لڑو یہاں تک کہ کفر کا علم سرنگوں ہو جائے۔ اور اللہ ہی کی اطاعت رہ جائے۔ (وَقَاتِلُوهُمْ حَتّٰى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ لِلّٰهِ) تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر جائے وہ اللہ اور اس کے رسول کا محارب ہے، اس کو قتل کردو (إِنَّمَا جَزَاءُ الَّذِينَ يُحَارِبُونَ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ وَيَسْعَوْنَ فِي الْأَرْضِ فَسَادًا أَنْ يُقَتَّلُوا الخ) جو چوری کرے اس کے ..... ہاتھ کاٹ دو۔ (وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا) جو بدکاری کرے اس کو سو کوڑوں کی سزا دو (الزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ)۔ جو کوئی کسی پاکدامن پر زنا کا جھوٹا الزام لگائے اس کو اسّی دُرّے لگاؤ۔ (وَالَّذِينَ يَرْمُونَ الْمُحْصَنَاتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَاجْلِدُوهُمْ ثَمَانِينَ جَلْدَةً) جو کوئی کسی کو عمداً قتل کرے

اُس کی بھی گردن اُڑا دو۔ (یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰی اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ الخ)

یہ ان بہت سے احکام میں سے چند ہیں جو ہماری اجتماعی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کو بطورِ مثال یہاں ذکر کیا گیا ہے، یہ سب کے سب اسی قرآن میں موجود ہیں جس میں نماز روزے کے احکام درج ہیں۔ اس لیے اس جماعت کے لیے جس نے اللہ کی کتاب پر پورا پورا عمل کرنے کا اقرار کیا ہے، یہ سارے احکام بھی اسی طرح واجب التعمیل ہیں جس طرح وہ دوسری قسم کے۔ ما بہ حقیقت یہ ہے کہ اپنی اساسی اہمیتوں کے پیشِ نظر ان میں سے اکثر احکام تو ایسے ہیں جو مدارِ ایمان اور شرطِ نجات ہیں اور ایک مسلمان کے لیے اولین توجہ کے مستحق، لیکن خالص "دینی اور متقی" حلقوں میں بھی ان پر عمل کا سراغ ملنا تو درکنار عمل کی خواہش کا وجود بھی عنقا ہے۔ آج ہمارا معبود اور شہنشاہ اللہ تعالیٰ ضرور ہے مگر مسجد کی چہار دیواریاں اس کی معبودیت اور شہنشاہیت کی آخری حدیں ہیں، اور مسجد سے باہر ہمارے اربابِ امر و حکم وہ لوگ ہیں جو ہماری ہی طرح مخلوق ہیں، اور خود بھی اسی ایک آقا کی غلامی اور اسی ایک حاکم علی الاطلاق کے قانون کی پیروی کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ ان میں سے اکثر تو وہ ہیں جو اللہ و رسول کے علانیہ باغی اور کفر و ضلال کے امام ہیں۔ اور کچھ ایسے بھی ہیں جو "مسلمان" ہیں، لیکن ایسے مسلمان جنہوں نے اللہ کے ان حقوقِ فرمانروائی کو، جن کا تعلق دنیا میں انسانوں کی اختیاری زندگی سے ہے، اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ قریب قریب پوری امتِ مسلمہ انہی دو قسم کے ارباباً من دون اللہ

کو اپنا صاحبِ امر و حکم بنائے ہوئے ہے۔ اب اس کے لیے قانون وہ ہے جو یہ خداوندانِ ارضی تا فکر کریں، نہ کہ وہ جو کتاب و سنت میں ہے۔ پھر جب انسانی زندگی کے بنیادی مسائل میں سے اس مرکزی مسئلہ میں کہ انسان کا اصل حاکم اور قانون ساز کون ہے، اس امت نے پہلے مداہنت اور بالآخر تعاون کی پالیسی اختیار کر لی اور اپنے ہی جیسے انسانوں کے ہاتھوں میں اپنے نظامِ سیاست کی باگیں دے کر انہی کو اپنا اصل آمر و ناہی تسلیم کر لیا تو اس کے وہ بہت سے مسائل زندگی جن کا تعلق براہ راست حکومت سے ہوا کرتا ہے۔ آپ سے آپ غیر قرآنی بنیادوں پر طے ہونے لگے۔ اب اس کے اصولِ زندگی، اس کے نظریات سیاسی، اس کے تصورات معاشی اور اس کے افکار عمرانی کی بنیاد ہی بدل گئی، اور اس کی زندگی کا پورا ڈھانچہ اور مسائل زندگی پر غور و فکر کرنے کا طرز ہی کچھ اور ہو گیا۔ اب اس کو اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کی غیر منقسم حاکمیت کے بجائے انسانوں کی حاکمیت میں اعتقاد ہے، اب وہ اس نظامِ زندگی کو، جو اپنے اصول و شروع میں سرتاپا غیر اسلامی، غیر قرآنی بلکہ کافرانہ ہے نہ صرف انگیز کر رہی ہے بلکہ اس کی مشین چلانے میں مسابقت دکھا رہی ہے، اب اس کے افراد نہایت اطمینان کے ساتھ اللہ کے نازل کردہ قوانین کو چھوڑ کر انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق فیصلہ کرتے اور کراتے ہیں حالانکہ انھیں علم ہے کہ اس معاملہ میں اللہ کا حکم یہ نہیں ہے۔ اب ارتداد، سرقہ، زنا، قذف اور قتل کے جرائم کی پاداش کہیں بھی قتل، قطع ید، جلد اور قصاص و دیت کی شکل میں نہیں دی جاتی۔ حالانکہ انھوں نے اپنے فرمانروائے حقیقی سے عہد

کیا تھا اور حلف وفاداری اُٹھایا تھا کہ ہم ان تعزیرات اور حدود کو قائم کریں گے
اس طرح قرآن کا ایک بڑا حصہ صرف کتابت اور تلاوت کے لیے مخصوص
ہو کر رہ گیا ہے جس کو اس کے ماننے والوں کی عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔
اگر انسان کے اندر تعلیماتِ قرآنی کا حقیقی فہم اور اسلام کی صحیح بصیرت موجود
ہو اور تاویلات و تسویلاتِ نفس نے اس کی روحِ ایمانی کو تھپکیاں دے کر
سُلا نہ دیا ہو تو وہ بیک نظر محسوس کر سکتا ہے کہ قرآن کے ساتھ بڑی حد تک
وہی سلوک کیا جا رہا ہے جو اہلِ کتاب نے توراۃ اور انجیل کے ساتھ کیا
تھا۔ چونکہ قرآن اللہ تعالیٰ کا آخری ہدایت نامہ تھا جس کے باعث اس نے
خود اس کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے، اس لیے یہ تو ممکن نہیں کہ گذشتہ
صحفِ سماوی کی طرح اس کتاب میں بھی لفظی تحریفات ہو جائیں، لیکن اس کے
علاوہ اور کوئی ظلم اور خیانت ایسی نہیں ہے جو دوسری اُمتوں نے اپنے صحیفوں
کے ساتھ روا رکھی ہو اور مسلمان اس سے باز رہے ہوں۔ عملی طور پر انھوں نے
قرآن کے ایک حصہ کو فراموش کر دیا ہے، مراحلِ زندگی میں اس کو آگے
رکھنے کے بجائے پیٹھ پیچھے رکھ چھوڑا ہے، اور "کچھ اقرار اور کچھ انکار" کی روش
پر لوگ اطمینان کے ساتھ چلے جا رہے ہیں اس لیے کوئی وجہ نہیں کہ قدرت
فَنَسُوا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوا بِهِ اور فَنَبَذُوهُ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ نیز أَفَتُؤْمِنُونَ
بِبَعْضِ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ کا الزام، ایک ہم وطنی میں ہی سہی
ان پر عائد نہ کرے اور اس انجام تک نہ پہنچا سکے جو اس کا قانون چاہتا ہے۔
شاہراہِ نجات | یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس صورتِ حال کا علاج کیا ہے؟

اور اس ملت نے اپنے آپ کو آگ کے جس گڑھے میں لا ڈالا ہے اس سے نکلنے کی سبیل کونسی ہے؟ اس سوال کا حل بھی ہم کو اسی کتاب کا قبول کرنا چاہیے جس کو ہم سچی ہدایت اور یقینی علوم کا تنہا منبع قرار دیتے ہیں۔ اور جس کی ہر بات کو بلا چون وچرا تسلیم کرنے کا ہم نے عہد کیا ہے۔ جس وقت یہ کتاب نازل ہوئی تھی۔ اس وقت پرانی آسمانی کتابوں کے پیرو، یہود و نصاریٰ، کچھ اسی قسم کے حالات سے دو چار تھے، جیسا کہ اوپر کے اجمالی اشارات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ جب اس نے ان کی گمراہیوں اور اعتقادی و عملی بےعنوانیوں نیز ان کے نتائجِ بد کا تفصیلی ذکر کیا تو ان کی رگوں میں جاہلی حمیت کی آگ بھڑک اٹھی۔ اور ضد میں آکر انھوں نے صدائے حق کے استیصال و ابطال کی کوششیں شروع کر دیں۔ سیاسی اور جنگی کوششوں کے علاوہ مناظروں اور مجادلوں کے معرکے بھی گرم کرنے لگے۔ ان تمام ہنگاموں کے پیچھے کچھ تو جاہلی عصبیت اور جوشِ عناد کارفرما تھا اور کچھ آسمانی مذاہب رکھنے کا نازِ بےجا اور ابناء اللہ اور احباء اللہ ہونے کا فریبِ نفس۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے بے اصل دعاوی اور ان کی کٹ حجتیوں کے جواب میں فرمایا۔

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ
حَتّٰى تُقِيمُوا التَّوْرَاةَ وَالْإِنْجِيْلَ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ (مائدہ ۱۰)

اے پیغمبر ان لوگوں سے صاف کہہ دو کہ اے اہلِ کتاب! تم ہرگز کسی اصل پر نہیں ہو جب تک کہ تم توراۃ اور انجیل کو اور جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر اترا ہے، قائم نہ کرو۔

یعنی تم اپنی موجودہ پوزیشن میں رہتے ہوئے ہرگز اس امر کے مستحق نہیں ہو کہ دلیل و برہان کے ساتھ دعوتِ حق کے بارے میں کلام کر سکو۔ تم نے وہ بنیاد ہی کھود کر پھینک رکھی ہے جس پر تمہارے وجودِ ملی کی عمارت کھڑی تھی۔ اس معاملہ میں تم بحث و جدال کے حقدار اسی وقت ہو سکتے ہو جب تم ان تمام ہدایات پر کاربند ہو جاؤ اور اپنی زندگیوں کو ان تمام احکام کا پابند بنا دو۔ جو سلطانِ حقیقی کی جانب سے تم پر مختلف وقتوں میں نازل ہوتے رہے ہیں تم نے کتابِ الٰہی کے جن حصوں کو اپنی دنیائے عمل سے خارج کر رکھا ہے، ان کو نافذ کرو۔ جن اصول و مقاصد کو تمہارے سامنے رکھا گیا تھا ان پر جم جاؤ، اور دین کی جن صداقتوں کا تمہیں علم دیا گیا تھا، ان کی حفاظت و بقا اور تبلیغ و اشاعت کا بھولا ہوا فریضہ یاد کرلو۔

پھر اس دینی و دنیوی ہلاکت سے جس کو ان لوگوں نے اپنی بدکرداریوں اور غلط کاریوں کے عوض خرید رکھا تھا، نجات کی جو شاہراہ قرآن نے تجویز کی وہ یہ تھی:۔

وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَ	اگر یہ اہلِ کتاب ایمان رکھتے اور خدا ترسی
اتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ	کی راہ چلتے تو ہم ان کی برائیاں ان سے
وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ وَلَوْ	محو کر دیتے اور نعمت بھری جنتوں میں ان
اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ	کو داخل کرتے اور اگر وہ توراۃ اور انجیل
وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ	اور ان ہدایتوں اور کتابوں) کو جو ان کے
لَاَكَلُوْا مِنْ فَوْقِهِمْ وَمِنْ	رب کی طرف سے ان کے پاس بھیجی گئی تھیں

مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِهِمْ ۔ قائم رکھتے تو ضرور ایسا ہوتا کہ ان کے اوپر سے بھی رزق برستا اور نیچے سے بھی اُبلتا۔ (مائدہ - ۱۰)

مرض کی یکسانی چاہتی ہے کہ علاج بھی ایک ہی ہو، ہلاکت و نامرادی جس راہ سے اہل کتاب کے یہاں آئی تھی، آپ نے دیکھا کہ اہل قرآن کے یہاں بھی اسی راہ سے آئی۔ اس لئے ضرور ہے کہ اس سے نجات بھی اسی طریقہ سے حاصل کی جائے جس کی اہل کتاب کو تلقین کی گئی تھی۔ قرآن کہتا ہو اور ظاہر ہے کہ اس کی بات کے سامنے کسی اور کی رائے سُننے اور ماننے کے ہم مجاز نہیں ـــــ کہ اہل کتاب نے کتب الٰہی کے کچھ حصوں کو ترک اور فراموش کر دیا جس کا نتیجہ رحمتِ الٰہی سے بُعد اور غضبِ الٰہی کے نزول کی شکل میں نمودار ہوا۔ جس سے بچاؤ کی واحد شاہراہ انہی کتابوں کا "قائم" کرنا تھا، اور اب اس قرآن کو ماننے اور "قائم" کرنے میں ہے۔ اگر ہمارے دل و دماغ قرآن حکیم کے اشارات سمجھنے کی صلاحیتوں سے بالکل محروم نہیں ہو چکے ہیں، تو ہمارے لئے اس پیغام کا سمجھ لینا چنداں دشوار نہیں جو اس کے اس کھلے ہوئے اشارے میں موجود ہے۔ جس کسی کو اللہ تعالیٰ نے گوشِ عبرت بخشا ہے وہ قرآن کے انہی لفظوں میں سے یہ آواز بھی سُن سکتا ہے کہ:-

"اگر قرآن کے پیرو ایمان رکھتے اور خدا ترسی کی راہ چلتے تو ہم ان کی بُرائیاں ان سے محو کر دیتے اور نعمت بھری جنتوں میں ان کو داخل کرتے۔ اور اگر وہ قرآن کو قائم کرتے تو ضرور ایسا ہوتا کہ ان کے اوپر سے بھی رزق برستا اور نیچے سے بھی اُبلتا۔"

نیز :-

"اے اہل قرآن! تم ہرگز کسی اصل پر نہیں ہو جب تک کہ قرآن کو قائم نہ کرو"

"قائم کر دینے" یا اقامت کے لفظی معنی ہیں سیدھا کرنے اور کھڑا کرنے کے، جب جسمی اشیاء کے لیے اس لفظ کا استعمال ہو تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ اس کی کجی دور کر کے اس کو سیدھا بنا دیا یا اس کو کھڑا کر دیا، لیکن جب معانی کے لیے اس کا استعمال ہو تو اس کے مطلب یہ ہوگا کہ اس چیز کو کامل اعتماد کے ساتھ اس کی مکمل ترین اور حسین ترین شکل میں اس طرح پورا کر دیا جائے جیسا کہ اس کا حق ہے۔ بازار کی "اقامت" کا مفہوم یہ ہے کہ اس کو اس تمام ضروری ساز و سامان اور حسنِ انتظام سے مالا مال کر دیا جائے جس کا بازار میں ہونا ممکن ہے۔ نماز کی اقامت کا مطلب یہ ہے کہ دوگانا اس کو ظاہری آداب اور باطنی محاسن سے اس طرح آراستہ رکھا جائے کہ کہیں کوئی نقص باقی نہ رہے اور نماز کا جو مقصود ہے وہ پورا پورا حاصل ہو جائے پس اقامتِ قرآن کا مدعا یہ ہوا کہ اس کے جتنے احکام ہیں سب کے سب نافذ ہوں، اس کے جتنے اصول ہیں ان سب کو اور صرف انہی کو مدارِ زندگی بنا لیا جائے۔ اس کی کسی ہدایت سے بال برابر بھی انحراف نہ کیا جائے۔ زندگی کے ہر دائرہ میں ہر شعبہ میں، ہر معاملہ میں صرف وہی نقطۂ نظر اختیار کیا جائے جو اس نے دیا ہے اور پوری سوسائٹی پر وہ رنگ چڑھا دیا جائے، جو وہ پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اس طرح پر کہ دیکھنے والوں کو یہ پورا ماحول قرآنی اور یہ پوری سوسائٹی ایک متحرک قرآن کی صورت میں نظر آئے۔ اسی کا نام اقامتِ قرآن ہے جس کو ہم اقا

دین بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ جو کچھ قرآن میں ہے اسی کے مجموعہ کا نام دین ہے اس لیئے اقامتِ قرآن اور اقامتِ دین در اصل ایک ہی حقیقت کی دو تعبیریں ہیں۔

پس اقامتِ قرآن یا اقامتِ دین ہی وہ واحد نسخۂ شفا ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اس امت کے آنے والے امراض کو دور کرنے کی خاطر پہلے ہی سے تجویز فرما دیا تھا۔ اور یہ بتا دیا تھا کہ یہی وہ شئے ہے جس پر تمہاری دنیوی فلاح، تمہاری اُخروی سعادت اور تمہارے ملی تشخص، ان تینوں چیزوں کا انحصار ہے۔ تم کو جب بھی ان چیزوں کی تلاش ہو، اس کے لیئے یہی راستہ اختیار کرنا، ورنہ باقی ہر طرف سراب ہی سراب ہے۔ جہاں سوائے حیرانی اور سرگشتگی کے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا، گویا پھر اسی مقام پر واپس جانے کا حکم دیا ہے جہاں سے تم ہٹ آئے ہیں۔ اس لیئے کہ پہلے بھی تو یہی اقامتِ دین ہماری زندگی کا تنہا وظیفہ تھا، چنانچہ کہا گیا تھا:

فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا....

ذٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ (روم - ۴)

سو تو اپنے رُخ کو یکسو ہو کر دین (اسلام) کی طرف سیدھا کر..... یہی سیدھا دین ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

یہ خطاب پیغمبر کی طرف! اور اس کے توسط سے ایک ایک فردِ امت کی طرف ہے۔ اس میں واضح طور پر مطالبہ کیا گیا ہے کہ ہر ایک قانون، ہر ایک ضابطہ اور ہر ایک طرزِ زندگی سے منہ موڑ کر اپنی تمام اطاعتوں کو اسی ایک طریقِ حیات یعنی دینِ اسلام کے لیئے مخصوص کر دو۔ اور دنیا میں اس طرح زندگی بسر کرو کہ ہر لمحہ تمہاری نگاہیں اسی دین کے اشاروں پر لگی رہیں اور تمہارا رُخ اسی دین کے

احکام و مطالبات کی طرف متوجہ رہے۔

پھر اس امت کے وجود کی غایت، جو ایسے افراد پر مشتمل ہو، یہ بتائی گئی تھی کہ:۔

وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ — اور اسی طرح ہم نے تم کو ایک عادل اور متوسط امت بنایا ہے تاکہ تم لوگوں کے لیے "حق" کے گواہ ہو۔ (بقرہ ۱۷)

یعنی اس حق پر جو پروردگار کی طرف سے نازل ہوا ہے، صرف اپنے طور پر عمل کر لینا ہی کافی نہیں ہے بلکہ تمام لوگوں کے سامنے اپنی زبان اور اپنے عمل اور بوقتِ ضرورت اپنے مال و جان سے اس حق کی گواہی دینا تمہارا فرضِ منصبی ہے۔ چنانچہ دوسری جگہ فرمایا گیا ہے کہ:

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ — تم وہ بہترین امت ہو جو تمام نوعِ انسانی کے لیے ظہور میں لائی گئی ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

معلوم ہوا کہ اس امت کا مقصدِ حیات اور اس کا نصب العین صرف یہی متعین کیا گیا تھا کہ وہ تمام اقوامِ عالم کو حق کی طرف بلائے، معروف کو پھیلائے نہ صرف پھیلائے بلکہ بزورِ حکم اسے نافذ کرے، اور بدی کے خلاف نہ صرف وعظ و تلقین کرے بلکہ اسے حکماً روک دے جس کو دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ زمین پر خدا کے دین کو قائم اور سب کو اسی کا محکوم بنا دے کیونکہ جس "حق" کا گواہ بنا کر اسے بھیجا گیا ہے وہ اسی "دینِ حق" کا نام ہے

اور جس "معروف" کے نافذ کرنے کا اس کو حکم دیا گیا ہے وہ انھیں اوامر کا نام ہے جو قرآن و سنت میں مذکور ہیں یا ان کے الفاظ سے مستنبط ہوتے ہیں، اور جس منکر کے استیصال کی ذمہ داری اس کے سر ڈالی گئی ہے اس میں وہ تمام چیزیں شامل ہیں جو احکام و شرائع دینی کے خلاف اور مزاج شریعت کے نا موافق ہیں۔

مقصد حیات اور نصب العین کی اس تعیین کے ساتھ یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اس امت کو جو عروج و اقبال بھی بخشا گیا تھا وہ اسی نصب العین سے وفاداری کا صلہ تھا، اور اس سے اللہ تعالیٰ نے فتح و نصرت کے جتنے وعدے کئے تھے وہ سب اسی اقامت دین کی شرط سے مشروط تھے۔ چنانچہ جب مسلمانوں کو یہ بشارت دی گئی کہ تم ہی سربلند ہوگے اور تمہارے مقابلہ میں تمہارے اعداء کا انجام شکست اور مغلوبیت ہوگا۔ تو اسی کے ساتھ ان کنتم مومنین کی شرط بھی لگا دی گئی تھی۔ یہ مشروط وعدہ ہنگامی نہیں بلکہ ابدی تھا جس کی شہادت اس حدیث سے ہوتی ہے جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے متعلق پیشین گوئی فرماتے ہوئے کہا تھا کہ الائمۃ من القریش ما اقاموا الدین (خلفاء قریش میں سے ہوتے رہیں گے جب تک کہ وہ دین کو قائم رکھنے کا فرض ادا کرتے رہیں)

اس ساری بحث سے چند باتیں ثابت ہوتی ہیں:

اولاً یہ کہ اس امت کا نصب العین اللہ کے دین کی اقامت تھا۔ ثانیاً یہ کہ اس فریضہ کو انجام دینے پر اللہ تعالیٰ کی غیبی اعانتیں اس کے شامل

حاصل ہوئی اور دنیا میں بے مثل قوت و اقبال سے سرفراز ہوئی۔ ثانیاً یہ
کہ اسی امت کے عروج و زوال کا انحصار محض طبعی اسباب و قوانین پر
نہیں ہے بلکہ خدائی قوانین پر یعنی اس فرض ہی کے بجالانے پر ہے جو اس
کے وجود کا مقصود ہے۔ اگر اس نے اس فرض سے پہلو تہی کیا تو دیگر
اقوام کی نسبت وہ اللہ تعالیٰ کے دربار سے دوگنی سزا کی مستحق ہوگی۔ ثالثاً
یہ کہ اس امت کے موجودہ حالات، کتاب اللہ کو عملاً ترک اور فراموش
کر دینے اور اقامت دین کے فرض سے بالکل غافل ہو جانے پر دلالت کرتے
ہیں۔ رابعاً یہ کہ ازروئے قرآن اس امت کی موجودہ ذلت و نکبت کا
علاج اسی فرض کو دوبارہ پہچان لینے اور اللہ کی کتاب یعنی اللہ کے دین کو
از سر نو قائم کر دینے میں ہے۔ سادساً یہ کہ اگر اس امت نے اپنی موجودہ
شکست و ریخت اور ذلت و نکبت کو دور کرنے کے لیے اقامت دین کی
راہ سے الگ کوئی راہ اختیار کی تو اس کی تمام تدبیریں اور کوششیں نہ
صرف یہ کہ ضائع جائیں گی بلکہ اس کو زندگی کی عظمتوں اور اللہ تعالیٰ کی
نعمتوں سے اور دور پھینک دیں گی اور وہ دوسری اقوام کے مقابلہ میں
دین کا سر رشتہ چھوڑ کر اور اس کی اقامت کا فریضہ فراموش کر کے کبھی
بھی آگے سبقت نہیں لے جا سکتی، اور اگر بالفرض کوئی سربلندی اس
کو ملے گی بھی تو غیروں کی مرہون ہوگی جس کا وجود بھی غیروں کے رحم و کرم
پر ہوگا۔ اور یہ بجائے خود ایک بڑی ذلت ہے۔

فرض ناشناسی اور حقائق سے چشم پوشی: ان حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے ایک

ایسے شخص کے لیے جو اللہ اور اُس کے رسول اور قرآن پر ایمان رکھتا ہو
جو مسلمان جینا اور مسلمان ہی مرنا چاہتا ہو اور جس کو کل قیامت کے دن
اپنے اعمال کی جوابدہی کا پورا احساس ہو، اس کے سوا کوئی چارہ نہیں
رہ جاتا کہ ہر طرف سے اپنی آنکھیں پھیر کر ہر آواز کے لیے اپنے کان بند
کر کے، ہر تسویلِ نفس اور ہر وسوسۂ شیطانی سے دل کو پاک کر کے اور سود
و زیاں کے تمام اندیشوں سے بے پروا ہو کر اس صراطِ مستقیم اور اس
شاہراہِ نجات پر اپنے قدم مضبوطی سے جما لے اور اپنے جسم و دماغ کی
ساری قوتیں اس دینِ حق کے قائم کر دینے میں لگا دے۔ وہ اپنے فہم و تدبر
سے کام لے کر اس کے لیے مناسب وقت تدبیریں سوچ سکتا ہے، حالات
زمانہ کے لحاظ سے ایک خاص طریقۂ عمل اختیار کر سکتا ہے۔ ماحول کے
تقاضے سے کوئی مخصوص پالیسی مرتب کر سکتا ہے لیکن اپنے اس
نصب العین، اور مقصدِ زندگی میں ترمیم کرنا یا اس کو ملتوی کر دینا اس
کے اختیار سے باہر ہے۔ وہ اس راہ سے ہٹ کر اور اس نصب العین
کو چھوڑ کر جو قدم بھی اُٹھائے گا وہ اللہ اور اُس کے رسول سے بغاوت
کا قدم ہوگا۔ اس وقت اس کی مثال [illegible] ان اندھے کی سی ہوگی
جو کسی گہرے کھڈ کی طرف بڑھ رہا ہو اور اس کا بھی خواہ رہبر چلا چلا کر
ادھر جانے سے منع کر رہا ہو اور صحیح راہ پر لانے کی کوشش کر رہا
ہو۔ مگر وہ ہے کہ ایک طرف تو وہ اپنے اس رہبر کی باخبری، اس کی
راست گوئی، اس کی خیر خواہی اور اس کے خلوص کا قصیدہ پڑھ رہا

اور ساتھ ہی دوسری طرف اسی سمت بڑھے جانے پر اصرار کر رہا ہے محض
اس بنا پر کہ اس سمت کی زمین اسے کچھ ڈھلوان معلوم ہو رہی ہے جس
پر قدم آسانی کے ساتھ پڑتے جا رہے ہیں۔ اور اس کی مخالف سمت کی زمین
کچھ بلند محسوس ہوتی ہے، جس پر قدم رکھنے میں چڑھائی کی دقتیں
اٹھانی پڑتی ہیں۔

لیکن بدقسمتی سے آج یہ پوری اُمت بالکل اسی اندھے کا پارٹ
ادا کر رہی ہے، وہ ہر اس سمت دوڑ پڑنے کے لئے تیار ہے جس پر
کسی قوم کو سرگرم سفر دیکھ پاتی ہے۔ صرف اس وجہ سے کہ اس کو یہ راہ بظاہر
سہل اور ہموار اور دلکش نظر آتی ہے۔ گرچہ وہ ٹھیک ہلاکت و نامرادی
کی جہنم تک منتہی ہوتی ہو۔ اگر کسی سمت اس کے قدم اٹھنے سے انکار کرتے
ہیں تو وہ وہی سمت ہے جو اقامتِ دین کی سمت کہلاتی ہے۔ اس لئے کہ
یہ راہ مشکلات کے کانٹوں سے بھری ہوئی دکھائی پڑتی ہے۔ قرآن اس
کو ہلاکت کی تمام راہوں سے روک کر اسی ایک راہ کی طرف بلاتا ہے، مگر
وہ سُنی ان سُنی کر دیتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ میں ہی تیرا بہی خواہ ہوں،
وہ جواب دیتی ہے کہ یہی تو ہمارا ایمان ہے، قرآن کہتا ہے کہ میں ہی
تیرا ہادی اور نجات دہندہ ہوں، وہ جواب دیتی ہے اس سے کس
کافر کو انکار ہے، قرآن کہتا ہے کہ میں کبھی جھوٹ نہیں بولتا، کبھی غلط
بات نہیں کہتا۔ کبھی اپنے دعاوے کی بنیاد وہم وگمان اور حرص وتخمین
پر نہیں رکھتا، وہ جواب دیتی ہے کہ لاریب! قرآن کہتا ہے کہ میرے پاس

اور صرف میرے ہی پاس علمِ حقیقت ہے، میں ہمیشہ صحیح راہ بتاتا ہوں، نجاتِ انسانی کا راز صرف میری تعلیمات میں مضمر ہے، وہ جواب دیتی ہے کہ بلاشبہ! قرآن کہتا ہے کہ جو کچھ میرے سوا ہے، وہ سب باطل ہے، جو میرے خلاف ہے وہ سراسر جہل ہے، جو مجھ سے ہم آہنگ نہیں، اس میں تباہی و نامرادی کے علاوہ کچھ نہیں۔ وہ جواب دیتی ہے کہ بالیقین! ——

لیکن جب وہ کہتا ہے کہ تیرے لیے میرے پاس صرف ایک پیام ہے، اقامتِ دین کا پیام، تو اس کی زبان جو ابتک اس کے ہر دعوے کی تصدیق کرنے میں اتنی تیز تھی، معاً بند ہو جاتی ہے۔ اور اس کی جگہ اس کا دماغ حیلوں اور تاویلوں کا ایک لشکر تیار کر کے سامنے آ جاتا ہے۔ تاکہ اس اضطراب کو کچل ڈالے جو اس منافقانہ خاموشی کے باعث اس کی روح کی گہرائیوں میں رونما ہوتا ہے۔ مجرم انسان، اگر اس کے اندر غیرت اور عزتِ نفس کی کوئی رمق باقی ہو، لوگوں کے سامنے مجرم کی حیثیت سے آنا کبھی گوارا نہیں کرتا۔ یا تو اس کی غیرت اور عزتِ نفس کی بیدار حس اس کو مجبور کر دیتی ہے کہ اپنے اس جرم کا کفارہ ادا کرے اور اپنے عمل کے ذریعہ اپنے دامن سے اس داغ کو دھو دے۔ یا پھر اس حس کے کمزور ہونے کی شکل میں اس کی تمام دماغی قابلیتیں اس بات پر صرف ہونے لگتی ہیں کہ کسی طرح اس جرم کو عین حق اور صواب ثابت کر دے۔ اس وقت اس کا نفس اس کو بے گناہی کا فریب دینے میں ہمہ تن مشغول ہو جاتا ہے اور اس کے حکم سے اس کا دماغ تاویلوں کا ایک خوشنما نقاب تیار کر دیتا ہے۔ جس کو وہ اپنے چہرے پر ڈال کر اپنے آپ کو یہ محسوس کرا لیتا ہے،

کہ میں سرا سر حق ہوں۔ اس کے بعد اس کی خواہش اور کوشش یہ ہوتی ہے کہ ساری دنیا کو ایسا ہی محسوس کرادے تاکہ اس کے دامن پر داغ گناہ کی طرف کوئی انگلی اُٹھانے والا نہ رہ جائے۔

قرآن کی علمبردار اور دینِ اسلام کی پیروی کا دم بھرنے والی اُمت اپنے فریضۂ ملی اور مقصدِ زندگی کی بجا آوری میں کچھ اسی قسم کے ادعائے بیگناہی کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ صدیوں کے انحطاط اور زوال نے اس کے احساسِ خودی کو بُری طرح مجروح کر ڈالا۔ اور ان جذباتِ عزم و ہمت سے سینوں کو ویران کر دیا ہے جو ایک نصب العین کی اقامت کے لئے ضروری ہیں۔ اور نصب العین بھی اقامتِ دین کا نصب العین۔ جو کبھی بھی آسان نہ تھا۔ اور جس میں جان و مال کی بازی، عیش و آرام کی قربانی اور اُمیدوں اور تمناؤں کی پامالی شرطِ اول قدم ہے۔ اسی لیے بجائے اس کے کہ وہ اپنے جرم کو تسلیم کر کے تلافیِ مافات کی کوشش کرتی اور اپنی ذمہ داریوں کا بار اُٹھا لیتی، سرے سے اپنی کوئی ذمہ داری ہی نہیں تسلیم کرنا چاہتی اور طرح طرح کی دور از کار تاویلوں سے اپنے رہے سہے احساسِ فرض کو دبا رہی ہے۔

گریز کی راہیں | آئیے ان تاویلوں کی یا ان کے پیش کرنے والوں کے بقول ان محکم دلائل کی حیثیت اور حقیقت پر غور کریں، جو اس ترک فرض کے جواز میں پیش کی جاتی ہیں:۔

ایک گروہ کا کہنا یہ ہے کہ ایک ایماندار اور صداقت شعار انسان

کے لئے پورے قرآن پر عمل کرنا کسی حال میں بھی ناممکن نہیں۔ اور جن کو اللہ نے حسنِ عمل اور خشیت و انابت کی توفیق بخشی ہے وہ آج بھی پورے دین پر عامل ہیں، اور وہ "مصروف کو بھی" اور "بالمعروف" کرتے رہتے ہیں۔ رہ گئے قرآن کے وہ احکام جن کا تم نے اوپر حوالہ دیا ہے، ان کا تعلق حکومتِ اسلامی سے ہے، اور ان کے مخاطب مسلمانوں کے اولوالامر ہیں، عوام نہیں ہیں۔ اس وقت چونکہ اسلامی حکومت قائم نہیں اس لیے ان احکام کے اجرا و نفاذ کی ذمہ داریوں کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اور اگر کچھ امر ایسے ہیں بھی جن کا تعلق براہ راست عامۃ المسلمین سے ہے، لیکن جن پر عمل نہیں ہو رہا ہے مثلاً تحاکم الی الطاغوت اور حکم بامر الطاغوت وغیرہ سے اجتناب، تو ایسا وہ اضطرار کر رہے ہیں، اور بحالتِ اضطرار ممنوعات بھی مباح ہو جاتے ہیں۔ اس لئے قرآن کے ایک حصہ کو ترک یا فراموش کر دینے کا الزام سراپا بہتان ہے۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ بلاشبہ از روئے کتاب و سنت ملتِ اسلامیہ کا فرض یہی ہے، لیکن موجودہ ناسازگار حالات میں اس نصب العین کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اس لئے اس وقت اس کے لیے جد و جہد کرنا وقت اور قوت کو ضائع کرنا ہے، اور اس کا اعلان و اظہار کرنا نہ صرف مصلحت کے خلاف اور عدم تدبر کی دلیل ہے بلکہ مداومت کے لئے سراسر مضر اور مہلک ہے۔ اس لئے سر دست کچھ ایسی دوسری تجاویز اختیار کی جائیں جو ممکن العمل ہوں اور تجربات سے مفید ثابت ہو چکی ہوں، اور جو ساتھ ہی آگے چل کر ہمارے اصلی مشن کے لئے حالات نسبتاً کچھ زیادہ سازگار کر دیں۔ اس وقت اس کے لئے براہ راست

جدو جہد شروع کی جائے گی۔

ایک کثیر تعداد ایسے لوگوں کی بھی ہے جو صفائی کے ساتھ اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ یہ نصب العین بالکل برحق ہے مگر ہم صدیقؓ اور فاروقؓ نہیں ہو سکتے۔ ہم جیسے کمزور لوگوں کے بس کا یہ کام نہیں ہے۔ جس مشن کو پیغمبر کی تربیت یافتہ جماعت بھی تیس برس سے زیادہ نہ چلا سکی، اس کے لئے ہم جیسے ضعیف الایمان لوگوں کا دم خم دکھانا تقدیر سے لڑنا ہے۔ اب وہ زمانہ نہیں آ سکتا جو تیرہ سو برس پہلے گذر چکا۔

کچھ لوگ ایسے ہیں جو تربص کی راہ پر گامزن ہیں۔ ان کو ملت کی موجودہ اجتماعی معصیت اور اس کے واحد نصب العین سے انکار نہیں، مگر پہلے وہ دیکھنا یہ چاہتے ہیں کہ اس نصب العین کے داعی اور مبلغ عمل کے میدان میں کتنی تیز گامی اور ثبات قدمی دکھاتے ہیں۔ چونکہ انھیں اس امر میں تشکک ہے کہ آزمائشوں کے وقت یہ اقامتِ دین کے مدعی میدان میں جمے رہیں گے اس لیے ان کے لیے اس جدوجہد میں شریک ہونے کا ابھی کوئی سوال نہیں۔

ایک بہت بڑا گروہ حضرت امام مہدی کے ظہور کا منتظر ہے۔ اس کو اس نصب العین کے برحق ہونے کا پورا یقین ہے مگر اس کا خیال یہ ہے کہ اس کے مکلف ہم نہیں ہیں۔ اس کام کے لیے اللہ تعالیٰ نے امام مہدی کے بھیجنے کا وعدہ فرمایا ہے۔ اس لیے ہم کو خواہ مخواہ یہ دردِ سر نہیں خریدنا چاہیے۔

یہ سارے گروہ اور ان کے یہ خیالات مسلمانوں کے ان طبقوں اور حلقوں سے تعلق رکھتے ہیں جو مذہبی اور دیندار خیال کیے جاتے ہیں۔ رہ گیا وہ گروہ جو دین

کے حلقہ کو اپنی گردن سے اتار کر پھینک چکا ہے۔ اور جو اپنے مسائل زندگی میں قرآن و سنت کو اتھارٹی تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں، تو اس کے خیالات سے ہم اس وقت تعرض نہیں کرنا چاہتے، ہمارے مخاطب اس وقت صرف وہ لوگ ہیں جو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کے فیصلہ کو آخری فیصلہ مانتے ہیں، اور جن کا دعویٰ ہے کہ وہ اپنے معاملات و مسائل میں شریعت کی ہدایات اور احکام کے سوا کسی اور حجت اور سند کے محتاج نہیں۔

باطل کے ساتھ اسلام کا طرز عمل | لیکن اس لمبی بحث کو شروع کرنے اور ان افکار پریشاں پر تبصرہ کرنے سے پہلے اسلام کی ایک اصولی ہدایت ذہن نشین کر لینی چاہیے جو ہماری زندگی کے ہر مرحلہ اور ہر موڑ پر دلیل راہ کا کام دیتی ہے اور التباس حق و باطل کے تاریک سے تاریک مواقع میں بھی اسلام کی صراط مستقیم آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتی۔ اس اصولی ہدایت کو سمجھ لینے سے اس بحث کی بے شمار الجھنیں خود بخود دور ہو جائیں گی۔ اسلام نے ہم کو حق کی پیروی اور باطل سے اجتناب کا حکم دینے ہی پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ ہمارے فرائض میں یہ چیز بھی شامل کی ہے کہ:-

لتامرون بالمعروف ولتنھون عن المنکر ولتاخذن علی ید المسئ ولتطرنه علی الحق۔ — تم ضرور معروف کا حکم دیتے رہنا اور بدی سے روکتے رہنا۔ بدکار کا ہاتھ پکڑ لینا۔ اور اس کو حق کی طرف موڑ دینا۔

اور اگر اس فریضہ کو نہ ادا کیا گیا، تو اس کا کیا انجام ہو گا؟ اس سے بھی خبردار کر دیا گیا ہے:-

او لیضربن اللّٰہ قلوب بعضکم علی بعض او لیلعننکم کما لعنہم	ورنہ اللہ تعالیٰ باطل پرستوں اور بدکاروں کے دلوں کا زنگ معصیت حق پرستوں کے دلوں پر بھی چڑھا دیگا یا تم پر اُسی طرح لعنت کریگا جس طرح یہود پر کی۔

ایک دوسری حدیث میں اس نہی عن المنکر کے طریق کار کی تشریح اس طرح کی گئی ہے :-

من رای منکم منکرا فلیغیرہ بیدہ	تم میں جو کوئی بدی کو دیکھے تو چاہیئے کہ
فان لم یستطع فبلسانہ فان	اسے ہاتھ سے مٹائے اور اگر ایسا نہ کرسکتا
لم یستطع فبقلبہ ولیس وراء	ہو تو زبان سے اور اگر یہ بھی نہ کرسکے تو دل سے
ذالک حبۃ خردل من الایمان	اس کے بعد ذرہ برابر بھی ایمان کا درجہ نہیں۔

ان ارشادات میں ہم کو اپنی حیات ایمانی کے چند اساسی اصول ملتے ہیں، ایک تو یہ کہ منکر سے بچنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس کا استیصال کرتے رہنا بھی ایک فرض دائمی ہے۔ دوسرے یہ کہ منکر کو برداشت کرنا۔ اس سے رغبت رکھنا نہیں بلکہ اس کو برداشت کر لینا ہی اجتماعی ہلاکت کے خطرہ کا لازم ہے۔ تیسرے یہ کہ اگر کسی شخص کے دل میں منکر سے نفرت اور اُس کو حق سے بدل ڈالنے کی تڑپ نہیں تو وہ ایمان سے بے بہرہ ہے۔

اب ہم ترتیب وار ہر گروہ کے خیالات اور دلائل کو اصول و نصوص کی میزان میں تولنا چاہتے ہیں تاکہ ان کا صحیح وزن معلوم ہو سکے اور نگاہوں کے سامنے سے وہ پردہ اُٹھ جائے جس کو سہولت پسندی اور ضعف

غم اور تلبیت احساس فرض کے ہاتھوں نے حقیقت کے چہرے پر ڈال رکھا ہے۔

(۱) کیا موجودہ عمل بالقرآن کافی ہے؟

اس امر کا دعویٰ تو کوئی بھی نہیں کر سکتا کہ قرآن و سنت میں صرف نماز، روزے، حج، و زکوٰۃ ہی کے فرائض کا ذکر ہے، اور مومن سے انہی احکام کی بجا آوری کا مطالبہ کیا گیا ہے، یا ان کے ماسوا جو احکام ہیں وہ نعوذ باللہ "محض بھرتی کے مضامین" کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ ان میں علمی طور پر جو فرق مراتب چاہیں قائم کر لیں اور ان کے اجر و ثواب میں بھی باہم جو نسبت چاہیں متعین کر لیں۔ لیکن عملی طور پر کسی تفریق کے نہ آپ حقدار ہیں اور نہ اس کی کوئی ضرورت ہے۔ ایک غلام کا فرض اپنے آقا کے ہر چھوٹے بڑے حکم کی تعمیل ہے۔ اس کو یہ حق کبھی نہیں پہونچتا کہ ضروری اور غیر ضروری کی بحثیں پیدا کر کے بعض احکام کو تو مانے اور بعض سے اغماض کر جائے۔ آقا کا حکم بہرحال حکم ہے، جو ہر صورت میں پورا ہونا چاہیئے۔ آپ نے بھی اللہ تعالیٰ کی کامل بندگی اور ہمہ وقتی غلامی کا عہد کیا ہے۔ اب (بطور مثال) اس آقا کی طرف سے دو حکم آتے ہیں، ایک تو یہ کہ نماز پڑھو، دوسرے یہ کہ چور کا ہاتھ کاٹ دو، اگر آپ ان میں سے پہلے حکم پر عمل کرتے ہیں، اور دوسرے کو سن کر خاموش ہو رہتے ہیں، تو آپ اپنے اس طرز عمل کو آقا کی کامل اطاعت اور اس کی کتاب الاحکام — قرآن — کی پوری پابندی کہہ سکتے ہیں؟ پھر یہ کیا ستم ہے کہ قرآن کے ایک دو نہیں بیسیوں احکام بالکلیہ متروک و مہجور کر دیئے گئے ہیں، اور پھر بھی آپ کو

خوش فہمی ہے کہ ہم عمل بالقرآن کے مطالبہ سے پوری طرح عہدہ برآ ہو رہے ہیں۔ آخر ایک مومن کا ضمیر اپنے فرض کی ادائیگی پر کس طرح مطمئن ہو جاتا ہے جبکہ وہ اپنے اوپر اور اپنے گردوپیش طاغوت کا تخت خداوندی بچھا ہوا پاتا ہے۔ اور معبودِ حقیقی کے بے شمار احکام کو معطل اور اس کی قائم کی ہوئی حدود کو ٹوٹتے ہوئے دیکھتا ہے۔ لیکن اس طاغوتی خداوندی کے تخت کو الٹ دینے، معطل شدہ احکام الٰہی کو نافذ کر دینے اور حدود اللہ کو توڑنے والوں پر ان تعزیرات کے جاری کرنے کا عزم اس کو ادائے فرض پر آمادہ یا کم از کم بے چین نہیں کر دیتا۔ جن کے جاری کرنے کا حکم اسے ملا ہے۔

عذر گناہ اس کے جواب میں جو عذر پیش کئے جاتے ہیں وہ عذر گناہ بدتر از گناہ کے مصداق ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ہم تو ان احکام کے سرے سے مکلف اور مخاطب ہی نہیں، ان کے نفاذ کی ذمہ داری تو مسلمانوں کے اولوالامر پر ہے آج چونکہ اسلامی حکومت موجود نہیں، اس لیے ان احکام کی تکلیف ہی ساقط ہو گئی ہے۔ حالانکہ قرآن میں کہیں بھی یہ نہیں کہا گیا ہے کہ اے مسلمانوں کے اولوالامر! تم چور کے ہاتھ کاٹ دو، یا زانی کو کوڑے مارو بلکہ فَاقْطَعُوْا فَاجْلِدُوْا وغیرہ کے الفاظ آتے ہیں جن کے مخاطب سارے اہل ایمان ہیں۔[1]

---

[1] چنانچہ اہل تفسیر آیت سرقہ کی تاویل میں فرماتے ہیں: یقول جل ثناءہ ومن سرق من رجل او امراۃ فاقطعوا ایہا الناس یدہ ...... فلا تفرطوا ایہا المؤمنون فی اقامتکم علی السراق وغیرہم من اہل الجرائم الذین اوجبت علیہم حدا فی الدنیا۔ یعنی اللہ عزوجل فرماتا ہے کہ، (بقیہ حاشیہ ص ۴۹ پر)

اور جن پر عمل کرنے کی اصل ذمہ داری پوری امت مسلمہ پر ہے نہ کہ کسی خاص فرد یا چند افراد پر۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ ان قوانین کا اجراء اولوا الامر ہی کریں گے کیونکہ نظم مملکت کا تقاضا یہی ہے، اس کے بغیر حکومت کا کاروبار چل ہی نہیں سکتا۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہی اولوالامر ان احکام کے مخاطب اول ہیں۔ نہیں مخاطب اول تو پوری جماعت ہے اور یہ اولوا الامر جماعت کے نمائندوں کی حیثیت سے ان کا نفاذ کرتے ہیں۔ پس جب جماعت کے یہ نمائندے موجود نہ ہوں تو اس ذمہ داری کا رخ آپ سے آپ اپنے مخاطب اول یعنی جماعت کی طرف مڑ جاتا ہے۔ گویا ان احکام کی نوعیت فرض کفایہ کی سی ہے کہ اگر اولوا الامر کے گروہ نے ان پر عمل کر دیا تو ساری امت کی طرف سے یہ فرض ادا ہو جاتے ہیں، ورنہ بصورت دیگر، پوری جماعت کے سر یہ فرائض رہ جاتے ہیں اور ایک ایک فرد اس کے لئے اللہ کی بارگاہ میں ماخوذ ہوگا۔

اس بارے میں اگر کوئی وزنی بات کہی جا سکتی ہے تو وہ صرف یہ کہ ہمارے پاس وہ سیاسی اقتدار کہاں ہے جو ان احکام کے نفاذ کے لئے ضروری ہے

(بقیہ حاشیہ ص ۴۸) "اے لوگو! جو مرد یا عورت چوری کرے اس کے ہاتھ کاٹ دو ....

اے مومنو! چوروں اور ان تمام مجرموں پر جن کے لئے میں نے دنیا میں سزائیں مقرر کر دی ہیں احکام جاری کرنے میں ذرا بھی کوتاہی نہ کرنا۔" دیکھئے ایک جگہ "فاقطعوا" کے مخاطبین کی تصریح "ایہا الناس" کے لفظ سے کی ہے، اور دوسری جگہ "ایہا المومنون" کے لفظ سے، "یا اولوا الامر" کہیں نہیں کہا گیا، پھر مزید وضاحت یہ کر دی کہ یہ خطاب صرف اسی آیت سرقہ میں نہیں ہے بلکہ تمام تعزیرات اسلامی میں یہی اصول کارفرما ہے۔

یقیناً یہ بات سنجیدہ غور و فکر کی محتاج ہے، اور یہ ایک حقیقت ہے کہ ایسے
احکام کے نفاذ کے سلسلہ میں اگرچہ اصل مخاطب اور ذمہ دار پوری جماعت ہے
مگر ان کا نفاذ جب ہوگا تو ایک قوتِ قاہرہ یعنی حکومت ہی کے ذریعہ ہوگا۔
افراد کو اس کا اختیار نہیں دیا جا سکتا ورنہ اگر ہر فرد بجائے خود اس فرض کو
ذاتی طور پر انجام دینے لگے تو زمین فتنہ و فساد سے بھر جائے اور اجتماعی زندگی
تباہ اور نظمِ جماعت پارہ پارہ ہو جائے۔ اس لیے ایسے احکام کے اجراء یا یوں
کہیے کہ قرآن کے ایک بڑے حصہ پر عمل کے لیے سیاسی اقتدار کا وجود ضروری ہے
لیکن سوال یہ ہے کہ اس سیاسی اقتدار کے نہ ہونے کی صورت میں ہماری اور آپ
کی ذمہ داریوں میں کمی آجاتی ہے یا وہ اور زیادہ سخت اور گراں ہو جاتی ہیں؟
آیا ہم کو خدا کا "شکر" ادا کر کے اس امر پر اظہارِ اطمینان کرنا چاہیے کہ چلو قرآن
کے ایک حصہ پر تو عمل کرنے سے آزادی ہو گئی۔ یا اس اقتدار کے حاصل کرنے
کی سعی کرنی چاہیے جس کے نہ ہونے کی وجہ سے ہم اپنے پروردگار کے کتنے ہی
احکام پر عمل پیرا ہونے کی سعادت سے محروم ہیں؟ نہ صرف سعادت سے محروم
ہیں بلکہ اس کی بندگی کا حق ادا کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی، اور کتابِ
الٰہی کو ترک اور فراموش کرنے کی قدیم سنتِ ضلال دہرانی پڑ رہی ہے۔ تھوڑی
دیر کے لئے اپنے دماغ کو منطقیانہ قیل و قال سے پاک کر لیجیے اور اپنے قلب
اور ضمیر کی آواز پر کان لگا کر سنیے کہ وہ ان سوالوں کا کیا جواب دے رہے ہیں؟
یقین جانیے جس قلب میں بھی ایمان کی حرارت موجود ہوگی وہ کبھی سکون اور
اطمینان کے ساتھ اس صورتِ حال کو برداشت کرنے کی اجازت نہ دے گا۔ اس لیے

ان احکام کو نافذ کرنے والی قوت کے حاصل ہونے کی شکل میں اگر اُمت پر صرف یہ ایک فرض عاید ہوتا ہے کہ وہ ان کو نافذ کرے، تو اس کے حاصل نہ ہونے کی صورت میں اس کی ذمہ داریاں دوچند ہو جاتی ہیں، پہلے تو اس قوت کو حاصل کرنا اور پھر ان احکام کو نافذ کرنا۔ یہ اصول کسی بحث کا محتاج نہیں کہ جو چیز کسی فرض کی ادائگی کا ذریعہ یا موقوف علیہ ہوتی ہے، اُس کی ادائگی خود فرض ہوتی ہے۔ آپ اس شخص کو ملامت کرنے میں شاید ایک لمحہ بھی توقف نہ کریں گے جو نماز اس عذر سے نہیں پڑھتا کہ اُسے قرآن یاد نہیں، یا جائے نماز ناپاک ہے، اور فوراً اس پر یہ الزام عاید کر دیں گے کہ یہ اپنا فرض ادا کرنے سے جی چُرا رہا ہے۔ اور اس کے دل میں نماز کی کوئی اہمیت اور محبت نہیں، ورنہ ایسا عذرِ لنگ اور مضحکہ خیز بہانہ نہ کرتا، اور دنیا کے سارے کاروبار چھوڑ کر سب سے پہلے قرآن یاد کرنے کی کوشش، یا جائے نماز پاک کرنے کی تدبیر کرتا، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ اوامرِ قرآنی کے ایک بڑے حصہ کو معطل کر کے آپ صرف اس بنا پر مطمئن بیٹھے ہیں کہ اس کے لیے جس سر و سامان کی ضرورت ہے، وہ میسر نہیں، اور پھر بھی آپ کی معصومیت اور آپ کے تقویٰ پر آپ کی نگہِ احتساب کوئی حرف نہیں رکھتی، اور آپ کو اپنے اس عذر میں کوئی بے وقعتی اور اس بہانہ میں کوئی مضحکہ خیزی نظر نہیں آتی۔ اگر یہ سر و سامان میسر نہیں تو کیا آپ کا — بشرطیکہ اپنے عہد کا پاس اور اپنے فرض کا صحیح احساس موجود ہو — یہ اولین فرض نہیں ہو جاتا کہ اپنی ساری قوتیں اور تدبیریں صرف کر کے اس سر و سامان کو حاصل کریں؟

خواہ اس کوشش میں آپ کو کیسی ہی مالی اور جانی قربانیاں کیوں دینی پڑیں، اس لیے کہ یہ جان اور یہ مال آپ کی ملکیت نہیں کہ انھیں سینت کر رکھا جائے تاکہ جس روز آپ نے ایمان کا اقرار کیا اسی روز یہ چیزیں اللہ تعالیٰ نے آپ سے اپنی رضا کے عوض خرید لیں، اور اب وہ آپ کے پاس اسی آقائے دو جہاں اور مالک جسم و جان کی امانت ہیں جس نے اپنے اوامر کی بجا آوری کا ہم سے اور آپ سے میثاق لیا ہے، اور یہ امانتیں ہمارے پاس صرف اس غرض سے رکھی ہیں کہ ان اوامر کی بجا آوری میں حسب ضرورت صرف کر دی جائیں۔ إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (اللہ نے مومنوں کی جان اور مال کو جنت کے عوض خرید لیا ہے) پس جو چیز خدا کی خریدی ہوئی اور آپ کے پاس بطور امانت رکھی ہوئی ہے اس کو عند المطالبہ اس کی راہ میں خرچ کرنے سے گریز کرنا بدترین قسم کا کمینہ پن اور خیانت ہے۔ اور نہیں کہا جا سکتا کہ وہ شخص اپنے اوپر کتنا بڑا ظلم کر رہا ہے جس کے پاس خدا نے اپنی چند امانتیں اس لیے رکھ چھوڑی ہیں کہ جب اس کی اطاعت امر کی راہ میں کوئی مانع پیش آئے تو وہ ان کے ذریعہ اس مانع کو دور کرنے کی سعی و جہد کرے۔ لیکن اس کا حال یہ ہے کہ موانع پیش آنے کی صورت میں بجائے اس کے کہ وہ ان امانتوں سے کام لیکر انھیں دور کرے اور اپنے آقا کا حکم بجا لائے۔ کرتا یہ ہے کہ موانع کی شکایت کر کے اس حکم ہی سے اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دے لیتا ہے۔ اور ان امانتوں کو غاصبانہ طور پر اپنی

اپنی خواہشوں کی چاکری میں لگا لیتا ہے۔

قانونِ اضطرار کی غلط تطبیق | یہ عذر تو ان احکام کے متعلق تھا جن پر کافرانہ اقتدارِ بالا کے باعث عمل ہو ہی نہیں سکتا، رہ گئے بعض وہ احکام جن پر عمل کرنے سے یہ اقتدار کفر بھی مانع نہیں ہے لیکن جو عمل بالقرآن کے ادعا کے باوجود بالکلیہ متروک ہیں، مثلاً تحاکم الی الطاغوت اور حکم بامر الطاغوت سے اجتناب وغیرہ۔ تو ان کا ترک کر دینا بھی اس وجہ سے کامل عمل بالقرآن میں حارج نہیں تصور کیا جاتا۔ کہ ایسا اضطراراً کیا جاتا ہے اور اضطرار کی حالت میں ارتکاب حرام گناہ نہیں۔ لیکن ایسا یا تو اپنی اجتماعی ذہنیت کے غلط مطالعہ کی بنا پر کہا جا سکتا ہے یا پھر رخصت اضطرار کی لازمی حدود و قیود سے انتہائی ناواقفیت کی بنا پر۔ قانون اضطرار کے الفاظ یہ ہیں:-

فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (بقرہ۔ ۲۱)

البتہ جو شخص مجبور ہو جائے (اور بحالت مجبوری حرام کھا کر اپنی جان بچا لے) بشرطیکہ اس حرام شے کے کھانے کی رغبت نہ رکھتا ہو اور نہ اس مقدار سے زیادہ کھانا چاہتا ہو جتنی کی زندگی بچانے کے لئے ضرورت ہے، تو اس پہ کوئی گناہ نہیں، (اللہ اس کو معاف کر دیگا کیونکہ) وہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

ان الفاظ سے جہاں بحالت مجبوری ایک ممنوع فعل کے ارتکاب کی رخصت معلوم ہوتی ہے، وہیں اس رخصت کے لئے تین شرطوں کی قید بھی ثابت ہوتی

ایک تو یہ کہ مجبوری واقعی ہو اور طلب و جستجوئے حلال کی تمام تدبیریں اس حد تک بیکار ہو چکی ہوں کہ بس لقمۂ حرام کے سوا اب جان بچانے کا کوئی ممکن ذریعہ نہ رہ گیا ہو۔ دوسری شرط یہ ہے کہ یہ استعمالِ حرام "غَیْرَ بَاغٍ" ہو۔ یعنی دل میں اس کی کوئی رغبت نہ ہو بلکہ جو ارتکاب حرام کیا جائے پورے احساسِ ناگواری اور شدید جذبۂ نفرت و کراہت کے ساتھ کیا جائے۔ تیسری شرط یہ ہے کہ یہ ارتکاب حرام بھی بس اسی حد تک کیا جائے جس حد تک جان بچانے کے لیے ناگزیر ہو۔ اگر ان تین شرطوں کے ساتھ کوئی شخص ایک فعلِ حرام کا مرتکب ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اس کو قابلِ معافی قرار دیتا ہے لیکن اگر ان تینوں شرطوں میں سے ایک شرط بھی تشنۂ تکمیل رہ گئی تو پھر یہ وعدۂ عفو و درگذر بھی شرمندۂ ایفا نہ ہوگا۔ شریعت اسی وقت اپنی یہ رخصت واپس لے لے گی، اور ایسا کرنے والا اس کی نگاہ میں نافرمان اور قابلِ مواخذہ قرار پائے گا۔

قانونِ اضطرار کی اس توضیح کی روشنی میں اپنے اجتماعی طرزِ عمل کا ٹھیک ٹھیک جائزہ لیجیے، اور پھر اپنی ملت کے ان خدا پرستوں کی تعداد بتایئے جو خداوندانِ باطل کے عرشِ فرمانروائی کے زیرِ سایہ رہنے، مسرفین کی اطاعت کرنے، طاغوت کا حقِ غلامی تسلیم کرنے، اسمبلیوں میں جا کر قانون ساز اور شارعِ دین بننے، طاغوتی عدالتوں میں اپنے معاملات لے جانے یا طاغوتی قوانین کے مطابق فیصلہ کرتے ہیں وہی مجبوری، وہی احساسِ ناگواری اور وہی جذبۂ کراہت محسوس کرتے ہوں جو ایک مومن کو سؤر کی بوٹی حلق سے نیچے اتارتے

میں محسوس ہو سکتی ہے۔ آخر کروڑوں انسانوں کا یہ انبوہِ گراں غیر اللہ کی حاکمیت اور مسرفین کی اطاعت کو حقیقتاً اسی اضطرار کے ساتھ برداشت کر رہا ہے جس کا قرآن میں ذکر ہے؟ کیا مسلمانوں کے یہ غول در غول جو صبح سے شام تک طاغوتی عدالتوں کا طواف کیا کرتے ہیں، یہ سب واقعتاً اپنے اس فعل کو حرام ہی سمجھتے ہیں اور اسکو محض انتہائی مجبوری کے وقت ہی اختیار کرتے ہیں۔ اور ان میں اپنی اغراضِ نفس کی پیروی، حدود اللہ سے بے اعتنائی اور احکامِ شریعت سے سرتابی کا کوئی داعیہ پنہاں نہیں ہوتا؟ اور وہاں صرف اس لیے جاتے ہیں کہ ان کی جان و مال کی حفاظت کا کوئی امکانی راستہ باوجود جستجو کے نہیں ملتا؟ اور کیا یہ جج اور مجسٹریٹ صاحبان جو اپنی زندگیاں آئینِ طاغوت کے مطابق "دادِ انصاف" دینے میں گذار دیتے ہیں۔ درحقیقت مخمصے کے شکار اور کسی مجبوری کے مارے ہوئے ہیں؟ اور جس وقت وہ اللہ جل مجدہ کے قوانین پس پشت ڈال کر شیاطین الانس کے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق معاملات کا فیصلہ کرتے ہیں، تو کیا ان کا دل اس فعل کی حرمت کا مقر اور اپنی اس فاسقانہ روش پہ متنفر ہوتا ہے اور وہ بالکل غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ ہو کر، بادلِ ناخواستہ اور بصد استکراہ اس ظلم و فسق کے اسٹیج پر بیٹھتے ہیں جس کو کرسیِ عدالت کہا جاتا ہے، اور جہنم کے ان دہکتے ہوئے انگاروں کو ہاتھ میں لیتے ہیں جن کو روپے کے نام سے اس کار گذاری کے عوض انھیں دیا جاتا ہے؟ اگر ایسا ہے تو یقیناً یہ سب لوگ فَلَآ اِثْمَ عَلَيْهِ کی رخصت اور آمرزش کے مستحق ہیں، اور ملت کو ترکِ کتابِ الٰہی کا ملزم گردانا سراپا ظلم و بہتان ہے۔ کاش ایسا ہی ہوتا۔ مگر حقائق کا کیا کیا جائے کہ وہ ہماری اس خواہش سے ایک فی صدی بھی موافقت نہیں کرتے۔ ایک ذرا انصاف سے کام لے کر دیکھا

پہنچا دو تا لیکن، تو مشاہدہ آپ کو اس حقیقت کے ماننے پر مجبور کر دے گا کہ اب
تو ان عدالتوں میں جاتے وقت یا ان کی کرسیوں پر بیٹھتے وقت شرطِ اضطرار
کی ضرورت کا تصور تک نہیں پیدا ہوتا۔ ان کرسیوں تک وہ مسلمان پہنچتا ہی کب
ہے جو معاشی خستہ حالیوں کے باعث جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھ سکتا ہو
اور اب اس کے سوا اس کے لیے اور کوئی چارۂ کار ہی نہ رہ گیا ہو کہ بقائے حیات
کے لیے یہ رزقِ خبیث قبول کر لے۔ ان جگہوں تک تو وہی پہونچ پاتے ہیں جو
پہلے ہی سے آسودہ حال ہوں، یا کم از کم یہ کہ اس مہلک افلاس میں مبتلا نہ ہوں
جس کو مخمصہ کہا جا سکے۔ اس لیے ازروئے واقعہ یہ سب کچھ نہایت ٹھنڈے
دل سے اور بالکل جائز سمجھ کر کیا جا رہا ہے۔ اولاد کو تعلیم دے کر تیار ہی اسی لیے
کیا جاتا ہے کہ ان کرسیوں تک پہونچ سکیں، اور جو پہونچ جاتا ہے وہ ترقی درجات
کی کوششوں میں مصروف رہتا ہے۔ حالانکہ اگر واقعی اضطراری حالت کی وجہ سے
اس نے یہ ذریعۂ معاش اختیار کیا ہوتا تو اس کے ایمان کا طبعی اقتضا یہ تھا
کہ اس میں ترقی کرنے کی جد و جہد کرنے یا اس پر مطمئن ہونے کی بجائے اسے
چھوڑ دینے اور کوئی جائز وسیلۂ رزق اختیار کرنے کے لیے بے چین رہتا، مگر
ایسے لوگ چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی شاید نہ مل سکیں۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا
کہ اس کھلی ہوئی طاغوت نوازی کو اضطرار کا نام کس طرح دیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح
اگر فی الحقیقت ہم غیر اللہ کی حاکمیت کو حرام سمجھتے اور ہماری غیرتِ ایمانی اس سے
متنفر ہوتی تو یوں گھروں کے عیش اور مدرسوں کی قیل و قال اور حجروں کی ہاؤ
ہو میں سکونِ قلب کے ساتھ مشغول نہ رہتے۔ اگر ہم سے کچھ نہ بن پڑتا تو کم

سے کم یہ تو ہونا چاہیے تھا کہ اس منکر اعظم کے ساتھ کسی قسم کا تعاون یا مداہنت کرنے کی بجائے اس کے خلاف زبان اور دل سے انتہائی نفرت کا اظہار کرتے کہ بقول رسول یہ ایمان کی آخری حد ہے، مگر یہاں حال یہ ہے کہ نہ صرف اس سے کسی نفرت اور کراہت کی ضرورت نہیں محسوس کی جا رہی ہے بلکہ اس کو برا ہی نہیں سمجھا جاتا اور اس کے قیام کے لیے حلف وفاداری اٹھائی جاتی ہے، اور اس کی بقا کے لیے جسم و دماغ کی ساری قوتیں نثار کی جا رہی ہیں۔ کیا ایک مبغوض شئے سے یہی برتاؤ کیا جا سکتا ہے؟ آخر اتنی بڑی عظیم الشان برائی کے ساتھ ایمان کے اس کم سے کم مقتضا کا تو اظہار ہونا چاہیے جس کی حدیث بالا میں وضاحت کی گئی ہے؟ یا اس سے بھی کم ایمان کا کوئی اور درجہ ہے؟ اضطرار کی بھی کوئی حد ہونی چاہیے ورنہ اگر اس کے دامن میں اتنی وسعت ہے جتنی آپ نے سمجھ رکھی ہے تو یقین رکھنا چاہیے کہ دنیا کی کوئی برائی اور قرآن کی کوئی قانون شکنی بھی اس کے دائرہ سے باہر نہیں رہ سکتی۔ اور ایک متبع قرآن اپنے نفس کی پیروی بالکل اسی بے باکی سے کر سکتا ہے جس بے باکی سے ایک منکر آخرت کرتا ہے اور اخلاق و خدا پرستی کے وہ سارے اصول و ضوابط بیکار ہو کر رہ جائیں گے جن کی تعلیم و تبیین کے لیے قرآن کا نزول اور صاحب قرآن صلعم کی بعثت ہوئی۔ لیکن یاد رہے اضطرار کی یہ وہ تاویل ہے جس سے اللہ اور رسول بالکل بری ہیں۔

اصل یہ ہے کہ جب ایک برائی کسی سوسائٹی میں نمودار ہوتی ہے تو ابتدا

میں سوسائٹی کا اجتماعی ضمیر اس پر نفرت اور ملامت کا اظہار کرتا ہے۔ اگر یہ جذبۂ نفرت و ملامت قوی ہو تو وہ برائی دب جاتی ہے، اور اگر یہ جذبہ اتنا کمزور ہو کہ اس برائی کو برگ و بار لانے سے نہ روک سکے تو اس کے جراثیم تیزی سے پھیلنے لگتے ہیں۔ اب اگر اس سوسائٹی کے خواص اپنے امکان بھر اس برائی کا استیصال نہ کریں بلکہ اس کے خلاف صرف اظہار خیال کر دینے ہی کو کافی سمجھیں تو رفتہ رفتہ ان کی نگاہیں بھی اس سے مانوس ہوتی چلی جاتی ہیں، اور زیادہ دن نہیں گذرنے پاتے کہ وہ برائی برائی نہیں رہ جاتی، اور خاص و عام سب اس کے رنگ میں رنگے نظر آتے ہیں، اس وقت وہ معاشرہ کا جزو لاینفک بن جاتی ہے اور اس پر استحسان یا کم از کم اباحت کا ٹھپہ لگا دیا جاتا ہے اور اس کے لئے اپنے مسلّمہ اصول اخلاق میں تنسیخ اور تغییر تک گوارا کر لی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کو جہاں اس بات کی ہدایت کر دی گئی تھی کہ نیکی کو پھیلاتے اور برائی کو مٹاتے رہنا وہیں اس خطرے سے بھی آگاہ کر دیا گیا تھا کہ اگر تم نے منکرات اور فواحش کی روک تھام نہ کی تو تمہارے دلوں تک وہ اپنے جراثیم پہنچا دیں گے اور تم خدا کی عنایات سے محروم اور اس کی لعنتوں کے مستحق ہو کر رہ جاؤ گے لیکن بد قسمتی سے مسلمانوں نے اس زریں ہدایت کو اپنے دماغوں میں محفوظ نہ رکھا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب ان کے دل، ان کے دماغ، ان کے نقطہ ہائے نظر اور ان کے انداز فکر بدل کر کچھ سے کچھ ہو گئے ہیں۔ اور جس چیز سے نفرت ہونی چاہیئے تھی اس سے رغبت کی جا رہی ہے، جس چیز سے بھاگنا

چاہیئے تھا، اُس کی طلب میں دوڑ لگائی جا رہی ہے، جس چیز کو پیروں تلے روند ڈالنا چاہیئے تھا وہ دانتوں سے پکڑی جا رہی ہے۔ ان کے پیغمبر نے یہ بتلا دیا تھا کہ ایمان کی آخری حد یہ ہے کہ ہر برائی سے دل میں نفرت رکھی جائے۔ ایسی نفرت جو اس برائی کو مٹا دینے کے لئے اکساتی رہے۔ ورنہ اس سے نیچے ایمان کا کوئی درجہ نہیں۔ یعنی کسی برائی کو نہ صرف برضاؤ رغبت قبول کرنے ہی کو منافیِ ایمان قرار دیا ہے بلکہ اس کو دیکھکر اپنے اندر جذبۂ نفرت کا نہ محسوس کرنا بھی ویرانیِ قلب اور محرومیِ ایمان کی یقینی علامت بتایا ہے۔ مگر اب اس تعلیم کے علمبرداروں کو اس امر پر بڑا اصرار ہے کہ ہم بلا اظہار کراہت اور بغیر کسی احساس نفرت کے غیر اللہ کی غلامی کا جوا اپنی گردنوں پر رکھیں گے، خود قانون ساز اور شارع دین بنیں گے، طاغوت کو اپنا حکم بنائیں گے، طاغوتی قوانین کے مطابق معاملات کا فیصلہ کریں گے اور پھر بھی نہ ہمارا دین جائے گا نہ ایمان خراب ہوگا، نہ ہماری توحید اور عبودیت میں فرق آئیگا، نہ اتباع قرآن میں فتور واقع ہوگا۔ نہ ہم پر کتاب الٰہی کے ترک و نسیان کا الزام وارد ہوگا۔ نہ ہم نقض میثاق کے مجرم ہونگے۔ کیونکہ ہم حالتِ "اضطرار" میں ہیں ع و

"وائے گر بیں امروز بود فردائے"

اس خیالِ خام اور فریب نفس کے مفاسد کا پورا پورا اندازہ آپ کو اس وقت ہو سکتا ہے، جب آپ ان مذکورہ بالا احکام قرآنی کے چھوڑ بیٹھنے کے ان دور رس نتائج کو سامنے رکھ لیں جو ہمارے انفرادی اور اجتماعی مسائل

زندگی کے اندر رونما ہوتے ہیں۔ غیر اللہ کی حاکمیت میں ایک وفادار رعایا بن کر رہنے کے معنی یہی نہیں ہیں کہ ہم نے ایک صریح حکم قرآنی کی خلاف ورزی کی بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اب ہماری زندگی شعوری یا غیر شعوری طور پر ایسے سانچے میں ڈھلتی چلی جائے گی جو اسلام کے مطلوبہ قالب سے بالکل مختلف ہوگا۔ اب ہمارے معاشرہ کی تاسیس، ہمارے تمدن کی اٹھان ہمارے نظام تعلیم کی تعمیر اور ہمارے مسائل معاشی و اقتصادی کی تنظیم ایسی بنیادوں پر ہوگی جو ہماری خواہشوں کے علی الرغم، ہم کو اپنے اجتماعی مسلک اور اپنے تصورات زندگی سے دور پھینکتی چلی جائیں گی۔ غیر الٰہی قوانین کے مطابق فیصلہ کرنے اور کرانے کا مطلب صرف یہی نہیں ہے کہ بس ایک گناہ سرزد ہو رہا ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان بہت سے احکام اسلامی کو لپیٹ کر رکھ دیا جائے اور ان کی وقعت دلوں سے محو ہو جائے جو ہمارے معاملات زندگی سے تعلق رکھتے ہیں اور ہم اپنے دین اور قرآن کو سمیٹ کر مسجدوں اور حجروں میں بند کر دیں اور دین کے صرف اتنے حصہ پر اکتفا کر لیں جس کا تعلق چند مخصوص مذہبی رسوم و شعائر اور عبادات سے ہے۔ چنانچہ اب یہ سارے نتائج قیاس کے دائرہ سے نکل کر واقعات کے عالم میں آچکے ہیں۔ اس ملت کے علمبرداروں نے قرآن کے ایک بڑے حصہ کو حکومت اور اولوالامر کے نام پر ترک کر کے اور عدم استطاعت اور اضطرار کے بہانے پیدا کر کے جن کا رہائے تاکردنی کو اختیار کیا اُن کا نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن کے بے شمار احکام اور اصولِ زندگی سے ان کا رشتہ کٹ گیا اور دین کے صرف

ایک محدود حصہ پر وہ عمل کر سکنے کے قابل رہ گئے۔ ابتداء میں دین کے ان بنیادی اصولوں اور اس کے مقتضیات سے اس جبری علیحدگی پر خود بھی ایمان مضطرب ہوئی، مگر امتداد زمانہ نے اس اضطراب کو سکون و اطمینان سے بدل دیا۔ اور اب انجام کار دماغوں پر غیر شعوری طور سے یہ وہم مستولی ہو گیا ہے کہ دین انہی چند عبادات کا نام ہے جن کو ہم ادا کر رہے ہیں، اور اس کے علاوہ جو کچھ ہے اس کا تعلق دنیا اور دنیا داری سے ہے۔ اس لئے اس قسم کے احکام و اصولِ قرآنی کے متروک ہو جانے کے باوجود ہمارا دین غیر مشکوک اور ہمارا اتباع قرآن کامل ہے، دراصل یہی تصور دین ہے جس نے ان احکام متروکہ کی اہمیت ہماری نگاہوں میں گھٹا دی ہے۔ اور اس حد تک گھٹا دی ہے کہ دلوں میں ان کے لئے کوئی اضطراب، کوئی تمنا اور کوئی حسرت باقی نہیں رہنے دی۔ مسجد کی ایک اینٹ بھی اگر کھود کر پھینک دی جائے تو اس گئی گزری حالت میں بھی مسلمانوں کی گردنیں خون کے دریا بہانے کے لیے تیار ہو جاتی ہیں، مگر اللہ کی بے شمار حدود کی بے حرمتی کو دیکھ کر تڑپنے کے لئے ایک دل اور بہنے کے لئے ایک قطرۂ اشک بھی تیار نہیں۔ اس فرق کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ وہ دین کا کام سمجھا جاتا ہے اور یہ دنیا کا۔ لیکن چونکہ ان حدود و احکام کا ذکر بھی اسی قرآن میں موجود ہے جس میں ان چند مخصوص عبادات کا اور ہر اس حکم کے اتباع کا عہد کیا گیا ہے جو قرآن میں ہے، اس لئے زبان سے یہ کہنے کی جرأت تو نہیں ہوتی کہ یہ حدود و احکام دین سے خارج ہیں لیکن جب اطاعت امر

اور ادائگی فرض کا سوال پیدا ہوتا ہے تو غیر شعوری طور پر دین کا وہی محدود تصور اور سہل پسندی کا مخفی جذبہ کبھی قانون اضطرار کی آڑ لینے پر مجبور کرتا ہے اور کبھی احکام کی ذمہ داری سے فرار کی سعی کی جاتی ہے۔

غرض غیرتِ ایمانی کی کمی، احساسِ فرض کی پژمردگی اور سہل پسندی و دنیا پرستی نے کافرانہ اقتدار اور کافرانہ اصول و نظریات کے سامنے سپر ڈال دینے پر آمادہ کیا، اس آمادگی نے قرآن کے ایک بڑے حصہ کو چھوڑنے پر مجبور کیا، اس مجبوری یا یوں کہئیے کہ جبری ارتداد نے اپنی خدا پرستی اور بے گناہی کا بھرم رکھنے اور اپنی نگاہوں سے آپ اپنی خطا کار صورت چھپانے کے لئے دین کا تصور محدود اور بے روح کر دیا، ایسا محدود کہ کہ جن احکام پر عمل نہیں ہو رہا ہے، ان کو دین ہی سے خارج کر دے، اور ایسا بے روح کہ زندگی کے میدان میں وہ کہیں، ہماری اغراض کے برخلاف مزاحم نہ ہو سکے، پھر اس محدود اور بے روح تصورِ دین نے ملت کی تمام فرض ناشناسیوں کمزوریوں اور بے عملیوں کی شناخت کا احساس فراموش کرا دیا۔ سب سے آخر میں سیاسی اقتدار کے فقدان اور اضطرار کے حیلے آئے اور انھوں نے اس پورے سلسلۂ اوہام پر حقانیت کا پردہ ڈال دیا۔ اب یہ تمام خود ساختہ اور فاسد نظریات ایک دوسرے سے غذا حاصل کر رہے ہیں، اور سب نے مل کر مغالطوں کا ایسا جال تیار کر دیا ہے جس کے گھیرے میں عقلیں چکرا رہی ہیں، اور ان کے سامنے راہِ حقیقت اس طرح مسدود ہے کہ اب ان میں تلاشِ منزل کے محرکات بھی دم توڑ رہے ہیں۔ اگر انسان میں اپنی غلطی کا احساس زندہ ہو تو امید

کی جاسکتی ہے کہ وہ ایک نہ ایک دن اس کی اصلاح کرے گا لیکن اگر یہ احساس مردہ ہوگیا اور اس کی نظر میں غلطی غلطی نہ رہ گئی تو پھر اس کے تائب ہونے کی تمام توقعات سراب ثابت ہوتی ہیں۔ اس لیے اگر اس ملت نے اپنی کامل تباہی اور دین و دنیا دونوں کی رسوائی کا تہیہ نہ کرلیا ہو تو اپنی بے گناہی کے زعم باطل سے اس کو جلد از جلد باز آجانا اور اپنا جرم تسلیم کرلینا چاہیئے۔

اللہ تعالیٰ کا قانونِ ہدایت بھی عجیب شانِ بے نیازی رکھتا ہے، ایک ہی چیز ہوتی ہے جس سے کسی کے سامنے ہدایت کے دروازے کھل جاتے ہیں اور وہ حقیقت کو پالیتا ہے، مگر وہی چیز دوسروں کو ضلالت کے فتنہ میں مبتلا کردیتی ہے۔ اور وہ راہِ راست سے اور دور ہوجاتے ہیں، اس قانون کا راز اللہ جل مجدہ کی اس سنتِ عدل میں ہے کہ جو حق کی سچی طلب رکھتا ہے اسی کے سامنے راہِ حق باز کی جاتی ہے، اور جو حق سے بے اعتنائی برتتا ہے، اس کے سامنے حق کی تجلی کبھی نہیں چمکتی۔ آفتاب کی شعاعیں ایک عالم کو منور کردیتی ہیں مگر چشم بوم اپنی کورنگاہی کی، بنا پر اس کے فیضان سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتی۔ یہی حال آفتابِ ہدایت کی شعاعوں کا بھی ہے۔ قرآن نے اپنی صفت جہاں یہ بتائی ہے کہ میں لوگوں کے لئے مشعلِ ہدایت ہوں، وہیں یہ بھی واضح کردیا ہے کہ بہتوں کے لئے وسیلۂ غوایت بھی ہوں، اس کے اس قول میں اسی قانونِ ہدایت کی طرف اشارہ ہے جس کے متعلق ہم یہاں گفتگو کررہے ہیں۔ وہ اسی شخص کو راہِ راست دکھاتا ہے جو دیکھنا چاہے اور اسی وقت دکھاتا ہے جب دیکھنے کی حقیقی آرزو ہو۔ یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ

اس کا یہ قانون صرف کفار کے لئے ہے اور مومن چونکہ اس پر ایمان لا چکے ہیں، اس لئے اب وہ اس قانون سے آزاد ہیں۔ نہیں، یہ کافر اور مومن سب کے لئے عام ہے، ایک مومن بھی قرآن پر ایمان رکھنے کے باوجود مراحل زندگی میں اس قرآن سے اسی وقت کسب ہدایت کر سکتا ہے جب وہ پورے اخلاص قلب کے ساتھ اس کی طلب بھی کرے، ورنہ جس وقت بھی اور زندگی کے جس معاملہ میں بھی اس نے اس سے رہنمائی کی خواہش نہ کی، اور غیر مشروط طور پر اس کی اقتدار کرنے اور اس غرض سے اس کا زاویۂ نگاہ معلوم کرنے کی کوشش نہ کی، وہاں یقیناً وہ اس کو گمراہی کی تاریکیوں میں بھٹکتا چھوڑ دے گا۔ اور اس امر کا کوئی لحاظ نہ کرے گا کہ وہ میرا منکر نہیں بلکہ ماننے والا ہے یہی وجہ ہے کہ مومن کو اس امر کی تلقین کی گئی ہے کہ ایمان لانے اور ہدایت یاب ہونے کے بعد بھی اپنے قلب و نظر کو کجروی سے مامون نہ سمجھے، اور ہر وقت اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا رہے کہ خدایا میرے سامنے سے ہدایت کی روشنی گل نہ ہونے پائے۔ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا۔

قرآن کے اِن احکام و فرامین کے بارے میں جو اس وقت زیر بحث ہیں، بالکل اسی مجرمانہ بے اعتنائی سے کام لیا جا رہا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ جہاں سے سمت منزل کی رہنمائی ہو رہی تھی، ٹھیک اسی جگہ سے بھٹکنے کا سامان فراہم کر لیا گیا۔ قرآن میں جو یہ الفاظ آتے ہیں کہ اے مومنو! ایک خدا کی فرمانروائی کے آگے خود جھکو اور سارے عالم کو جھکا دو، اے ایمان لانے والو! کفر کے علمبرداروں سے لڑ کر فتنہ کا سر کچل دو، اے ایمان کی کھنے والو

معروف کا حکم دو، اور منکر سے روک دو، اے مسلمانو! چور کا ہاتھ کاٹ دو،
اور زانی کو دُرّے لگاؤ، وغیر ذٰلک۔ تو اس اندازِ خطاب کی اصل بنیاد ایک
ایسی عظیم الشان حقیقت پر تھی کہ اس کا صحیح تصور ہی اس کارگہِ
حیات میں مومن کا مقام متعین کر دینے کے لئے کافی تھا۔ اگر ہم طالبِ حق
بن کر قرآن پر نگاہ ڈالتے تو پاتے کہ یہ طرزِ خطاب اس امر کی کھلی ہوئی دلیل ہے
کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں اس اُمت کی حیثیت ایک حکمران پارٹی کی سی ہے اور
اس کا مقام رہبانیت کے حجروں میں یا محکومی کے جوئے تلے نہیں ہے، بلکہ
امامت و جہانبانی کے تخت پر ہے۔ اور اس مسندِ امامت سے نیچے وہ اس کی
حیثیت کو فرض ہی نہیں کرتا، نہ اس سے کم پوزیشن میں کبھی اس کو دیکھنا
چاہتا ہے۔ سوچئے تو سہی زندگی کا کتنا بلند، حریت آموز اور جاں بخش
تصور تھا جو اس اسلوبِ بیان میں موجود ہے اور قلبِ مسلم کو کیسے پاکیزہ اور عالی
عزائم سے معمور کر دینے والا سبق تھا! اس اشارۂ قرآنی میں چھپا فکر و نظر کا منظر
ہے، مگر قصورِ نظر کا بُرا ہو، زندگی کا پیغام یہی ہمارے لئے موت کا پروانہ بن گیا۔
چاہیئے تو یہ تھا کہ اللہ ربّ العزت کے اس طرزِ خطاب کے راز کو سمجھا جاتا، اپنا
کھویا ہوا مقام اور بھولا ہوا فریضہ یاد کیا جاتا اور اپنی کوتاہیوں پر نادم
ہو کر ان کی تلافی کی سعی کی جاتی اور پھر اس مقام کی بازیافت کی سرفروشانہ
جد و جہد کی جاتی جہاں ہمارا شہنشاہِ مطلق ہم کو دیکھنا چاہتا ہے۔ مگر ہوا
یہ کہ یہی اندازِ خطاب ہمارے لیے بے عملی کے جواز کی سند اور اقامتِ حق
کی راہ کا روڑا بن گیا، اور یہ کہا گیا کہ چونکہ ان احکام کے مخاطب حکامِ خلافت

ہیں اور اس وقت ہم کو خلافت کا اقتدار حاصل نہیں ہم نے اپنی ذمہ داری
کا بوجھ اتار کر پھینک دیا، یہ طرزِ فکر و عمل بالکل ایسا ہی ہے کہ ایک مسلمان
جب قرآن و سنت پر نظر ڈالے اور دیکھے کہ مسلمان کی تعریف اور اسلام کا
معیار یہ ہے کہ وہ متقی اور صالح ہو، متواضع اور زاہد ہو، تمام اخلاقِ حسنہ
سے متصف اور رذائل بد سے مجتنب ہو۔ حدود اللہ کا پابند ہو اور وہ تمام
حقوق کا پورا کرنے والا ہو۔ یہ دیکھ کر کہ وہ اس معیار تک پہونچنے کی اس
بناپر کوشش نہ کرے کہ میں ضعیف الایمان بھلا اس مقام تک کب پہونچ
سکتا ہوں، ایمان کا یہ معیار اور بلند درجہ تو بس صحابہ ہی کے لیے مخصوص
تھا لیکن ظاہر ہے کہ یہ طرز فکر کتنا غلط ہے۔ اگر کوئی مسلمان قرآنی معیار
ایمان سے فروتر ہے تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ اس معیار تک پہنچنے
کی ہر ممکن سعی کرے نہ کہ مشکلات کی فہرست سنا کر مطمئن ہو رہے۔

بالکل یہی روش آیتِ اضطرار کے بارے میں بھی اختیار کی گئی،
غیر باغٍ ولا عادٍ کی شرط لازم میں غیرتِ حق کے تحفظ کا جو راز پنہاں تھا
اور زندگی کے نازک سے نازک اور ناموافق سے ناموافق مواقع میں بھی
اپنے مقام کی عظمت برقرار رکھنے اور اپنے مطمحِ نظر کا پاس رکھنے کا جو
اصول پوشیدہ تھا اس کی طرف تو نظر نہیں گئی یا پہنچی ہو تو نظر کو بند
کر لیا تھا لیکن فَلَا اِثْمَ عَلَیْہِ کی آڑ لے کر اباحت کا دروازہ کھول لیا
گیا۔ بلاشبہ اس آیت میں بحالتِ مجبوری ایک فعلِ حرام کے ارتکاب کی گنجائش
عطا کی گئی ہے لیکن یہ اس آیت کا صرف ایک پہلو ہے، اور اس کا دوسرا

پہلو جو اپنی اہمیت کے لحاظ سے پہلے کی نسبت کہیں زیادہ لائق اعتناد
ہے، نظروں سے بالکل اوجھل ہے جس کا مدعا یہ ہے کہ ہم کبھی کسی
حال میں بھی، کسی امر منکر پر قلب کی ادنیٰ سے ادنیٰ رضامندی کے ساتھ نہیں
جم سکتے۔ بلکہ اگر کبھی ایسی صورت پیش آجائے تو اپنے تمام افکار کو اسی
ایک فکر میں تحلیل کر دینا کہ کسی طرح اس ادہم بلا سے نجات مل جائے جس
میں سوء اتفاق نے لا پھنسایا ہے اور جب تک یہ نجات نہ مل سکے بس
یوں سمجھنا کہ مردار کا سڑا ہوا گوشت ہے جس کو دانتوں سے نوچ رہا ہوں،
یا خنزیر کی بوٹیاں ہیں جن کو نگل رہا ہوں، یا عفونت بھری غلاظت ہے،
جس میں جسم اور کپڑے لت پت ہو گئے ہیں۔ اس احساس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ
ہم اس حرام شے سے دور ہو جانے کی بالکل اس طرح بے تابانہ کوشش
کریں گے جس طرح کسی آدمی کا پاؤں پھسلے اور تپتے ہوئے سنگریزوں پر
پڑ جاتا ہے تو وہ تلملا کر فوراً ہی اس کو اٹھا لینے اور کسی نرم اور ہموار
زمین پر رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

اس آیت کا دیا ہوا یہ درس اگر ہم کو یاد ہوتا تو اس وقت ہماری
دنیا یہ دنیا نہ ہوتی اور وہ شکست خوردہ ذہنیت، وہ پست نقطۂ نگاہ اور وہ ایمان
سوز طرز فکر ہماری قوتوں کو اس طرح مفلوج نہ کر دیتا جیسے حاوی ہو کے نفس نے
کلام الٰہی کو اپنا آلہ کار بنا کر ہمارے اندر پیدا کر دیا ہے، اور کروڑوں انسانوں
کی اتنی بھاری جمعیت اضطرار کے نام پر قرنوں تک منکرات اور خبائث کے ساتھ
اس طرح کی قابل شرم سازگاری نہ دکھاتی کہ اتباع قرآن کا دعویٰ رکھنے کے

باوجود اس کا قافلہ کفر و فسق کی بنائی ہوئی روش پر پورے ذوق و شوق کے ساتھ چلا جا رہا ہے۔ اور اس کے دل میں کبھی کوئی غیرت، کوئی نفرت اور کوئی بے چینی نہیں محسوس ہوتی۔ منکرات کے ساتھ سازگاری دکھانے کے بجائے ہم ان کے خلاف مجسم احتجاج ہوتے۔ ہمارا ذوقِ ایمانی ہماری زندگی کو تلخ بنا دیتا اور ہماری غیرتِ اسلامی ہم کو مجبور کر دیتی کہ اس غلاظتِ کفر کو جس طرح بھی ہو سکے اپنے دامن سے دھو کر دم لیں۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ ہم کو اضطرار کی رخصت تو یاد رہ گئی مگر غیر باغٍ ولا عادٍ کی شرط اور اس شرط کے لوازم اور مقتضیات کو دانستہ یا نادانستہ بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تریاق زہر کا کام دینے لگا۔

پس اس امت کے لئے ترکِ کتابِ الٰہی کے جرم اور اس جرم کی رسوا کن سزاؤں سے نجات پانے کی اگر کوئی راہ ہے تو صرف یہ کہ وہ اپنی تمام تر کوشش کو اس صورتِ حال کے بدل ڈالنے پر مرتکز کر دے جس میں وہ اپنے حاکمِ اعلیٰ کے فرامین سنتی ہے مگر عمل نہیں کرتی یا نہیں کر سکتی، نہ یہ کہ اضطرار اور عدم استطاعت کا بہانہ کر کے اور اپنے جرم پر پردہ ڈال کر مطمئن ہو رہے۔ یہ اطمینان دراصل ایمان کے کھوکھلے ہونے یا دین کی حمیت سے محروم ہونے کی دلیل ہے اور فریبِ نفس کا ایسا خطرناک طلسم ہے جو اگر پوری قوت سے نہ توڑا گیا تو قلبِ امت کی وہ ضعیف ترین دھڑکنیں بھی ختم ہو جائیں گی جو ابھی تک کبھی کبھی محسوس ہو جاتی ہیں۔

اقامتِ دین کے امکان و عدم امکان کی بحث

عدم امکان کے قائلین | اب اس گروہ کے خیالات کو لیجیے جو اس نصب العین — اس واحد فریضۂ حیات کی بجا آوری سے اس لیے کترا رہا ہے اور دوسروں کو بھی کترا کے چلنے کا مشورہ دے رہا ہے کہ بحالتِ موجودہ اس کی کامیابی کا کوئی امکان نہیں اور دین کی اقامت کے لیے براہ راست جدو جہد کرنا نہ صرف ضیاعِ وقت ہے بلکہ مفادِ ملی کے لیے تباہ کن بھی ہے، اس لیے عقل چاہتی ہے اور مصلحت اس کا تقاضا کرتی ہے کہ فی الحال اس کا نام نہ لیا جائے اور اپنی ساری قوتیں کسی ایسے مورچہ پر صرف کر دی جائیں جہاں سے ہم اپنے ماحول کے بدلتے ہوئے حالات پر اس حد تک اثر ڈال سکیں کہ آئندہ چل کر حالات ہماری اس جدو جہد کے لیے نسبتاً زیادہ سازگار ہو جائیں اور وہ دورِ سعید آ جائے جس میں ہم بہ آسانی اپنے نصب العین کی طرف بلا نیہ مارچ کر سکیں۔

اس نظریہ پر غور کیجیے تو ذہن میں چند سوال پیدا ہوتے ہیں:—

(۱) کیا اس فریضہ کی ادائیگی کے لیے براہ راست جدو جہد کرنے میں اس کی کامیابی کے امکان و عدم امکان کی بحث پیدا بھی ہو سکتی ہے؟

(۲) کیا دین کی اقامت واقعی ناممکن ہے؟

(۳) ناسازگاری حالات کی بنا پر اس تنزل مقصود کی طرف پھیر کے راستوں سے پیش قدمی کرنے کی کوئی عملی مثال، کوئی انسانی تجربہ یا کوئی صحیح فکری بنیاد موجود ہے؟

انہی سوالوں کے صحیح جواب میں اس نظریہ کا مستقیم وعدہ اپنا مستور ہے اس لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ اللہ کی کتاب اور اس کے پیغمبروں کے طریق کار اور اُسوۂ اعمال سے یہ جوابات حاصل کیے جائیں، اللہ کی کتاب سے اس لیے کہ اسی نے اپنے پیروؤں پر یہ بارِ عظیم ڈالا ہے، اور ساتھ ہی اس کو یہ دعویٰ ہے کہ وہ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ ہے، اس لیے یہ ممکن نہیں کہ تمام معاملات میں تو اس نے ہماری رہنمائی کی ہو اور اس معاملے کو تاریکی میں چھوڑ دیا ہو، جو پورے صحیفۂ زندگی کا سرعنوان اور تمام فرائضِ دینی کا صدر نشین ہے اور اللہ کے رسولوں کے طریق کار اور اُسوۂ اعمال سے اس لیے کہ ان پاکان خاص اور ان کے سچے اور کامل پیروؤں کے سوا دنیا کسی ایسے انسان یا انسانی گروہ سے واقف نہیں ہے جس نے اس نصب العین کو اپنایا ہو۔

ادائے فرض بحث امکان سے بے نیاز ہے

قرآن مجید نے اس چیز کو کہ اپنے منصب یا نصب العین کی خاطر جد وجہد بہرحال ضروری ہے اور اس میں انجام کی پروا کیے بغیر ہر وقت لگے رہنا چاہیے، اتنی وضاحت سے بیان کیا ہے اور انبیائے کرام نے اپنے عمل سے اس اصولِ زندگی کی ہمہ گیری اور صداقت کی ایسی روشن شہادتیں بہم پہنچائی ہیں کہ ایک منکرِ قرآن ہی اس کے انکار کی جرأت کر سکتا ہے۔ ہر نبی کو منصبِ رسالت پر مامور کرتے ہی اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ لوگوں کے سامنے اس حقیقت اور اس مطالبہ کا اعلان کر دو کہ:-

أَنِ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ — لوگو! اللہ کی بندگی کرو اور "طاغوت" کے اتباع سے بچو۔

..... أَنَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ — میرے سوا کوئی معبود نہیں، سو میری ہی عبادت کرو

چنانچہ اسی اعلان سے ہر نبی نے اپنی دعوت کی ابتدا کی۔ یہ چند حرفی اعلان درحقیقت اسی انقلابی مشن کا ایک اجمالی مینی فسٹو ہے جس کو قرآنی اصطلاح میں اقامتِ دین کہتے ہیں۔ یعنی ہر نبی نے آتے ہی اپنے اس نصب العین کا اظہار کیا اور لوگوں کو اس کی طرف بلایا اور خود اس کے لیے عملی سعی و جہد شروع کر دی کہ خدا کی زمین پر صرف اسی کا نازل کیا ہوا ضابطۂ حیات نافذ ہوا اور نافذ رہے۔ "عبادت" "الٰہ" اور "طاغوت" کے موجودہ بے جان تصورات کے پیشِ نظر اس بات کے اندر کچھ مذہبیانہ غلو محسوس ہوگا۔ کہ ایک اللہ کی عبادت کی دعوت دینے کی معنی یہ ہیں کہ ہر نبی نے اقامتِ دین کی جدوجہد شروع کر دی۔ لیکن قرآن نے اس وہم کا خود ہی استیصال کر دیا ہے اور صاف صاف بتا دیا ہے کہ حاملینِ توراۃ و انجیل و قرآن ہی کو یہ فریضہ نہیں سپرد کیا گیا تھا بلکہ ہر نبی کا مقصدِ بعثت یہی تھا:

شَرَعَ لَكُم مِّنَ الدِّينِ مَا وَصَّىٰ بِهِ نُوحًا وَالَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهِ إِبْرَاهِيمَ وَمُوسَىٰ وَعِيسَىٰ أَنْ أَقِيمُوا الدِّينَ (شوریٰ - ۱۳)

اللہ نے تمہارے لئے وہی دین مقرر کیا ہے جس کی (پیروی کی) نوح کو وصیت کی تھی اور جس کی (اے نبی) تمہاری طرف وحی کی ہے اور جس کا ہم نے ابراہیم و موسیٰ و عیسیٰ (وغیرہ تمام انبیاء اور اُن کے پیرووں) کو حکم دیا تھا اور کہا تھا کہ اس دین کو قائم کرو۔

غرض قرآنی تصریحات گواہ ہیں کہ بلا استثناء ہر نبی کو اللہ واحد کے نازل کردہ دین کی دعوت اور اقامت کا فرض سپرد کیا گیا تھا اور پھر قرآن ہی اس بات پر بھی گواہ ہے کہ ہر نبی نے اس امر کی بجا آوری اس شان سے کی کہ نہ تو کبھی اس دعوت کے

کامیاب ہونے پر خدا سے گارنٹی طلب کی، نہ ایک لمحہ اس کے انجام پر فکر و تامل میں ضائع کیا، نہ اس کے امکان اور عدم امکان کا اُن کے ذہنوں نے سوال اُٹھایا نہ حالات کی ناسازگاری ایک آن کے لیے ان سے اس آواز کو سینہ میں دبا رکھنے کا مطالبہ کر سکی، بلکہ ہر ایک نے اپنی بعثت کی ابتدا سے زندگی کے آخری لمحہ تک اپنے اس فرض کو پورا کیا۔ ان میں اگرچہ ایسے تھے کہ ان کی دعوت الی الحق نے کامیابی حاصل کی، اور وہ دنیا چھوڑنے سے پہلے سچے خدا پرستوں کا ایک گروہ پیدا کر گئے تو بیشمار ایسے بھی تھے جن کی آواز آخر تک بے حس دلوں کی چٹانوں سے ٹکرا ٹکرا کر واپس ہوتی رہی۔ نوح علیہ السلام نے تقریباً ایک ہزار سال کے طویل و نہار اس ادائے فرض میں صرف کر ڈالے مگر اس طویل اور صبر آزما سعی کا انجام ان گالیوں اور پتھروں کی شکل میں نمودار ہوتا رہا جن سے اُن کی "قوم" رات دن ان کو نوازتی رہتی تھی۔ اور جب ان کی ادائیگی فرض کا زمانہ ختم ہوا تو ان کی دعوت قبول کرنے والوں کی تعداد گنتی کے چند افراد سے زیادہ نہ تھی۔ ابراہیم علیہ السلام نے بڑھاپے کی عمر تک اس عبادت اللہ اور اجتناب طاغوت کا پیغام سنایا اور اللہ کے دین کو قائم کرنے کے لیے لگاتار کوششیں کرتے رہے۔ اس کوشش اور پیغام رسانی کے دوران میں انھیں جن جن ابتلاؤں اور جانکاہ مصیبتوں سے گذرنا پڑا، اُن کے تصور ہی سے دل کانپ اُٹھتا ہے لیکن اس ساری تگ و دو اور ان پیہم قربانیوں کا ثمرہ یہ نکلا کہ ان کے اپنے اہل و عیال کے سوا مشکل ہی سے کوئی ان کی آواز پر لبیک کہنے والا تھا۔ حضرت لوط، شعیب، ہود، صالح اور عیسیٰ وغیرہ انبیائے کرام کے سوانح حیات

بیش و کم اسی قسم کے حالات و مناظر دکھائی پڑتے ہیں۔ پھر اسی طائفہ میں حضرت یحییٰ اور ان ہی کی طرح کے کچھ دوسرے انبیاء بھی موجود ہیں، جن کی تبلیغ و ہدایت کا انجام یہ نظر آ رہا ہے کہ کلمۂ حق سننے والا تو ایک فرد بھی نہ ملا لیکن کسی کی گردن پھانسی کے پھندوں میں دیدی گئی، اور کسی کے سر پہ آرے چلا دیئے گئے۔

وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ۔

خاتم النبیین صلے اللہ علیہ وسلم کا دورِ نبوت اس حقیقت کا سب سے بڑا شارح ہے۔ آپ کو اسی پیغام کے ساتھ، جو ہر نبی کو برائے تبلیغ ملا تھا اور اقامتِ دین کے اسی مشن کو، جس کو ہر نبی لے کر آیا تھا، مبعوث فرمایا گیا، ایک طرف تو یہ پیغام بھی پہلے کی بہ نسبت کامل اور وسیع المعانی تھا۔ دوسری طرف مخاطب ایک مخصوص سرزمین کے بجائے پورا ربع مسکون تھا۔ اور اس "ربع مسکون" کا حال یہ تھا کہ اس کے ایک ایک گوشہ میں طاغوت کا علم گڑا ہوا اور کفر و شرک کا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اس حال میں خدا کا یہ آخری پیامبر آتا ہے اور آتے ہی وہی بات بغیر کسی لاگ لپیٹ کے اپنے لوگوں کو سناتا ہے جو ہر نبی سناتا آیا ہے۔ تدریجاً دعوت کا حلقہ وسیع ہو رہا ہے یہاں تک کہ پورے تین سال بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ اللہ کی جناب سے تبلیغ و اعلانِ عام کا حکم دے دیا جاتا ہے:۔

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ (حجر-۶)

جس بات کا تجھ کو حکم دیا گیا ہے اسکو واشگاف کہدو اور مشرکوں کی پروا نہ کرو۔

خدا کا نبی امتثالِ امر کے لئے فوراً تیار ہو جاتا ہے، اور جو بات اب تک وہ اپنے عزیزوں اور قرابت داروں سے گھروں کے اندر اور دیواروں کے

پیچھے سنایا کرتا تھا، اسے اب پہاڑ کی چوٹیوں پر چڑھ کر سارے عرب و عجم کو ہانکے پکارے سنانے لگا، سننے والوں نے جس طرح اس پکار کا جواب دیا اس کو مکہ اور طائف کی گلیاں قیامت تک نہ بھولیں گی۔ لیکن خدا کے اس فرض شناس بندے کو ان باتوں کی ذرا بھی پروا نہیں ہوتی۔ اس اگر پروا ہوتی ہے تو یہ کہ جس کلمۂ حق کی تبلیغ و تفہیم کا فریضہ مجھ پر عائد کیا گیا ہے اس کے سنانے سمجھانے میں کوئی کسر نہ رہ جائے۔ اور جس صداقت پر ان گم کردہ راہوں کی فلاح و نجات منحصر ہے اس کو یہ سنتے اور مانتے کیوں نہیں! اس کی ساری تمنائیں، اس ایک آرزو میں آ کر سمٹ گئی ہیں کہ کسی طرح میری بات دلوں میں اتر جائے۔ اور جس ہدایت کو اللہ تعالیٰ نے میرے ذریعہ نازل فرمایا ہے اس کو یہ لوگ قبول کر لیں۔ مگر اللہ تعالیٰ ہے کہ اس کو بار بار محبت کے ساتھ جھڑکتا ہے اور یہ حقیقت ذہن نشین کراتا ہے کہ تمہارا کام صرف پہنچا دینا اور کھول کھول کر امر حق بیان کر دینا ہے، اگر ایک شخص بھی اس امر حق کو سن کر توجہ نہیں دیتا تو اس کی کوئی پروانہ کرو۔ (فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ الْمُبِينُ) یہ کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر بیٹھا رہا ہی بگاڑیں تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔ تم اپنی اس دعوت کا کام انجام سے بے پروا ہو کر بجا لاتے رہو۔ یہ نہ سوچو کہ کیا ہو گا ہو سکتا ہے کہ تم اپنی آنکھوں سے اس دعوت کو کامیاب اور اس کے دشمنوں کو تباہ و برباد دیکھو اور اس کا بھی امکان ہے کہ ایسا نہ ہو۔

وَإِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِي نَعِدُهُمْ اور اے پیغمبر! جس عذاب کی ہم ان منکروں أَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَإِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ کو دھمکی دے رہے ہیں یا تو اس کا کچھ حصہ ہم

فرلفیر اقامت دین

ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيدٌ عَلٰى مَا يَفْعَلُونَ ہمکو وکھلا دینگے اور تمہاری نگاہ ہونگے سامنے ہی یہ اپنے انجام بد سے کسی قدر دوچار ہو لینگے) یا ہمکو (یونس ۵۰)

وفات دیدیں گے سو ہماری ہی طرف تو ان کو پلٹ کر

آنا ہے، پھر یہ یقین رکھیں کہ ان کے سارے

اعمال خدا کی نگاہ میں ہیں۔

بعثت محمدی پر ایک دوسرے پہلو سے بھی غور کیجئے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تبلیغ ہدایت کے بعد ساری دنیا کا بالعموم اور قوم عرب کا بالخصوص دو میں سے ایک نتیجہ ہونے والا تھا۔ یا تو وہ اس پر ایمان لاکر اللہ تعالیٰ کی رحمت بےکراں سے سرفراز ہو یا انکار کرکے ہمیشہ کی لعنت اور دائمی عذاب خریدے۔ ایک معمولی انسان بھی اپنی قوم کو اس طرح بدترین ہلاکت ہوتا دیکھنا گوارا نہیں کرسکتا، کجا کہ وہ انسان جو محبت و رافت کا پیکر اور رحمۃ للعالمین تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب اکثر ناعاقبت اندیشوں نے اس حق کی تکذیب اور مخالفت کرکے ہلاکت کی راہ چلنی چاہی تو آپ کا دل خون ہونے لگا۔ اس فکر میں کہ کسی طرح یہ لوگ راہ راست پر آجائیں۔ زندگی کا ایک ایک لمحہ سخت قلق اور اضطراب میں گذرتا تھا۔ رات کی رات اس الحاح و زاری میں بسر ہو جاتی تھی کہ خدایا! اس قوم کو ہدایت دے، اس کے دلوں کی آنکھیں کھول دے کہ وہ تیرے غضب سے بچ جائیں۔ یہ جوش رافت اور جذبۂ غمگساری اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ حالت شرک میں مرجانے والوں کے حق میں بھی دعائے استغفار کرنے سے آپ باز نہ رہ سکتے اور جب اللہ تعالیٰ

نے اپنا یہ اٹل فیصلہ سنا دیا کہ "ان کے لیے دعائے مغفرت نہ کرو۔ اگر تم ایک بار نہیں ستر بار استغفار کرو تو بھی میں ان کو بخشنے کا نہیں۔" رحمتِ عالم کی زبان پکار اٹھی "خدایا! میں ان کے لیے ستر بار سے بھی زیادہ استغفار کرونگا۔" آپ سے بڑھکر اس امر واقعہ کا کون ادراک رکھتا تھا کہ یہ قوم اس خطرناک آزمائش میں صرف میری بعثت کی وجہ سے ڈالی گئی ہے۔ جس کا اگر ایک پہلو بہجت پرور ہے تو ساتھ ہی دوسرا پہلو جانگداز بھی ہے۔ اگر ایک طرف خلافتِ ارضی کی سرفرازیاں اور فردوسِ بریں کی بہاریں ہیں تو دوسری طرف غضبِ الٰہی کی ہلاکت خیزیاں اور عذابِ جہنم کی الم ناکیاں بھی ہیں اور قوم ہے کہ اسی دوسرے پہلو کو اختیار کرتی اور اسی دوسری طرف جانے پر اصرار کر رہی ہے لیکن پیغمبرِ عالم یہ سارا دہشت ناک ڈراما اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود اپنے کو مجبورِ محض پا رہا تھا۔ اور قوم کے درد میں تڑپنے کے باوصف اس صورتِ حال میں کسی ادنیٰ تغیر کی بھی مجال اور گنجائش نہیں دیکھتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ یہ میری ہی دعوت لا الٰہ الا اللہ کا ثمرہ ہے کہ شاید یہ قوم عاد و ثمود کی طرح پیوندِ خاک کر دی جائے۔ ممکن ہے یہود کی طرح ابدی لعنت میں مبتلا ہو جائے۔ ہو سکتا ہے کہ جنگ و جدال کی نوبت آ جائے، بھائی بھائی کا گلا کاٹنے لگے، باپ بیٹے کے خون کا پیاسا ہو جائے یعنی رشتے کٹ جائیں، خاندان تباہ ہو جائیں، وطن تاراج ہو جائے ـــــ لیکن ادائے فرض کی ناگزیری کا کیا علاج! اسے غیب سے کھینچا ہے تو کھنچے، دل ابتلاءِ تحسر کے ہجوم سے مضطرب ہے تو مضطرب رہے، گردنیں اس بارِ گراں کے دباؤ سے شل ہوتی ہیں تو ہو جائیں،

اور کمر اس بوجھ سے دو نیم ہو رہی ہے تو ہو جائے، مگر یہ کوئی اپنی سوچی ہوئی اسکیم تو نہیں ہے کہ ملتوی یا ترک کی جا سکے یہ تو بھیجنے والے کا مقرر کیا ہوا "فریضۂ زندگی" ہے جس کو ہر حال میں پورا ہونا چاہیئے ـــ پیغمبر کے دل کے یہی سارے جذبات ہیں جو ان آیات کے اندر جھلک رہے ہیں:-

قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِنْ
تِلْقَاءِ نَفْسِي إِنْ أَتَّبِعُ إِلَّا مَا يُوحَىٰ
إِلَيَّ إِنِّي أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي
عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ قُلْ لَوْ شَاءَ اللَّهُ
مَا تَلَوْتُهُ عَلَيْكُمْ وَلَا أَدْرَاكُمْ
بِهِ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِنْ
قَبْلِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ

(یونس - ۲)

اے پیغمبر! ان لوگوں سے کہدو کہ مجھے اس بات کا ذرا استحقاق نہیں کہ بطور خود اس قرآن میں کوئی رد و بدل کردوں میں تو بس اسی چیز کا تابع ہوں جو مجھ پر وحی کی جاتی ہے۔ اگر میں نے اپنے رب کی نافرمانی کردی تو مجھ کو ایک بڑے دن کی سزا کا ڈر ہے، اور کہو اگر اللہ کو منظور ہوتا تو میں یہ قرآن تمھیں پڑھکر سناتا ہی نہ اور نہ وہ تم کو اس کی اطلاع دیتا۔ چنانچہ اس سے پہلے میں تمہارے اندر ہی ایک عمر گذار چکا ہوں (اُس وقت تو میں نے کوئی چیز تمہارے سامنے نہیں پیش کی تھی کہ اب یہ قرآن اپنے جی سے بنا کر تم کو سنانے لگا) کیا تم اتنی بات بھی نہیں سمجھتے!

لوگوں کا "حالات زمانہ" سے واقف اور "مصلحت شناس" لوگوں کا ـــ مطالبہ یہ تھا کہ جس قرآن کو آپ پیش کر رہے ہیں اس کی تعلیمات ہماری قومی نفسیات سے میل نہیں کھاتیں نہ "احوال و ظروف حاضرہ" سے سازگاری رکھتیں

اس لیے اس کے بجائے کوئی دوسرا قرآن لائیے جس میں یہ "خامیاں" نہ ہوں یا اسی قرآن میں کچھ اس طرح کی ترمیم و اصلاح کر دیجیے کہ اس ماحول میں ٹھیک بیٹھ سکے۔ (ائْتِ بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَٰذَا أَوْ بَدِّلْهُ ۔ یونس ۱۵) ورنہ اگر آپ نے من وعن اسی قرآن اور اس کی تعلیمات کی تعلیم و ترویج پر اصرار کیا تو یاد رکھیے کہ ایک فتنہ اٹھے گا اور قومی عمارت کے ایک ایک گوشہ کو تہ و بالا کر کے رکھ دیگا پیغمبر یہ خطرہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا، بلکہ وہ خطرہ بھی جو آنے والی زندگی سے متعلق تھا۔ ان دو بینوں کی تذکیر کا محتاج نہ تھا۔ مگر ساری بات کی ایک بات یہ تھی کہ آخر وہ کرتا تو کیا کرتا، سوا اس کے کہ حسرت و اندوہ بھرے لہجے میں ان کو یہ سنا دے کہ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِن تِلْقَاءِ نَفْسِي الخ

یہ انبیاء کے ان احوال و سیر کے چند مشہور و مستند حقائق اور واقعات ہیں جو سوجھ بوجھ رکھنے والوں کی عبرت پذیری اور حق نمائی کے لیے قرآن حکیم میں بیان کیے گئے ہیں۔ ان واقعات میں جو اصول حق سب سے زیادہ نمایاں اور جو نقش حقیقت سب سے زیادہ ابھرا ہوا دکھائی دیتا ہے وہ یہی ہے کہ اللہ کے دین کی اقامت کے لیے کوئی شگون لینے کی ضرورت نہیں، نہ حالات کی سازگاری کا کوئی اندازہ لگانے یا کامیابی کے امکانات ٹٹولنے کی گنجائش ہے، جو چیز ہمارا فریضۂ زندگی قرار پا چکی وہ حقیقت سے اس بات کی مستحق ہے کہ جب تک زندگی ہے اس کے لیے جد و جہد کرتے رہیے۔ وہ فرض فرض نہیں جس کو مشکلات کے اندیشے

منسوخ کر دیں، جو امکان و عدم امکان کی بحثوں کا زخم کھا سکے۔ اگر دعوت توحید اور اقامت دین کا کام شروع کرنے سے پہلے امکانات کا ٹٹولنا ممکن ہوتا تو یقین جانیے کہ انبیاء کی ایک بڑی تعداد اپنے مشن کا اظہار تک نہ کرتی، اس کے لیے سعی و کوشش تو درکنار۔ کیونکہ عموماً ہر نبی توحید کی دعوت اور اقامت دین کا مشن لے کر دنیا میں بھیجا ہی اس وقت جاتا تھا جب حالات کی ناسازگاری اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی، جب کلمۂ حق کا نشوونما بظاہر ناممکن سے ناممکن تر ہو چکا تھا۔ جب صدائے توحید بلند ہوتے ہی ہر طرف سے کنکر پتھر برسنے لگتے تھے۔ لیکن حالات کی اس شدید نامساعدت مشکلات و موانع کی اتنی زبردست مزاحمت اور امکان کامیابی کی اس انتہائی قلت کے باوجود، جس سے ہم اپنے موجودہ حالات کا کوئی مقابلہ نہیں کر سکتے۔ انھوں نے کشتی بحر ظلمات میں ڈال دی اور ذرا نہ سوچا کہ ساحل کہاں اور کدھر ہے؟ موسم پر سکون ہے یا طوفانی؟ بادبان ٹھیک ہے یا نہیں؟ ہوا کا رخ کیا ہے؟ کشتی کھینے والے بازوؤں میں توانائی کتنی ہے؟ سمندر بیدا کنار ہے یا ناپیدا کنار؟ راستہ صاف ہے یا زیر آب چٹانیں ہیں؟ انھوں نے ان میں سے کسی بات پر بھی تامل نہ کیا۔

مشکلات راہ اس فرض کی اہمیت کم نہیں زیادہ کرتی ہیں،

اب اگر ہم نے انبیاء کے قصص احوال کو مشرکین عرب کی طرح اساطیر الاولین کی حیثیت دے رکھی ہے اور ان کو زمانہ قدیم کی ایسی داستانیں سمجھ بیٹھے ہیں جن کی ہم اپنی زندگی کا سفر طے کرنے میں کسی قسم کی احتیاج نہیں رکھتے

سوا اس کے کہ آیاتِ قرآنی سمجھ کر محض حصولِ ثواب کے لئے ان کی تلاوت
کر لینی چاہیئے تب تو بات ہی اور ہے۔ لیکن اگر واقعہ یہ نہیں ہے اور ہماری
بدبختیوں نے ابھی تک ہم کو نَسُوا اللّٰہَ فَاَنْسٰھُمْ اَنْفُسَھُمْ کی حد تک
نہیں پہونچایا ہے، بلکہ ہم ان قصص کو اسی طرح مشعلِ ہدایت اور ذریعۂ اعتبار و
بصیرت یقین کرتے ہیں جس طرح قرآن نے ہم کو بتایا ہے، تو ہم انبیاء کی
اس مقدس تاریخ کے ہر دور اور ہر ورق سے یہی ایک غیر متغیر اصول
سیکھ سکتے ہیں کہ جس چیز کو ہمارے پروردگار نے ہمارا مقصدِ زندگی ٹھیرا
دیا ہے اس کی خاطر جدوجہد ہر حال میں ہونی چاہیئے نہ صرف یہی کہ یہ
جدوجہد ہر حال میں ہونی چاہیئے اور اس کے لئے مشکلات راہ اور ناسازگار
ماحول کا کوئی لحاظ نہیں کیا جا سکتا۔ بلکہ یہ دیکھتے ہوئے کہ ہر نبی بالعموم
ایسے وقت میں اس کام پر متعین کیا جاتا رہا ہے۔ جب کہ حق و ایمان کی
روشنی اس زمین سے بالکل مفقود ہو چکی تھی، اور کفر و مادیت کی آفاق
گیر تاریکی میں اس جدوجہد کے لئے امکان کامیابی کی کوئی کرن دور دور
تک کہیں نظر نہیں آتی تھی، یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ جدوجہد ایسے ہی ماحول
سے مانوس ہے۔ اور جس زمانہ میں لوگ حق سے جتنا ہی زیادہ بیگانہ
ہوں، دہریت و مادیت کا جتنی ہی زیادہ گرم بازاری ہو اور طاغوت کی
حکمرانی جتنی ہی زیادہ وسیع، ہمہ گیر اور مستحکم ہو، علمبرداران حق پر اقامتِ
دین الٰہی کا فریضہ اتنا ہی زیادہ اہم اور سنگین ہو جاتا ہے۔ اس لیے
اگر حالات کا یہ صحیح اندازہ ہے کہ دنیا حق سے اتنی ہی برگشتہ اور متنفر

ہو چکی ہے کہ اسے دینِ حق کا نام بھی سننا گوارا نہیں تو یہ اقامتِ دین کی
جد و جہد میں کسی تعطل یا تخفیف کا باعث نہیں ہے بلکہ اس میں انتہائی
سرگرمی، جوش اور انہماک کا طالب ہے۔

فریضۂ زندگی کا مقام اہلِ کفر کی نگاہوں میں

زندگی کا یہ اصل الاصول نصب العین کی
فطرت ہی یہ ہے کہ وہ امکان و عدمِ امکان
کی بحثوں کا متحمل نہیں ہو سکتا، ایسا محکم اور عالمگیر ہے کہ نہ صرف اسلام ہی
نے اس کا اپنے پیروؤں سے مطالبہ کیا ہے، اور نہ صرف انبیاء اور ان کے
سچے متبعین ہی نے اس پر عمل کر کے دکھایا ہے، بلکہ کافروں اور خالص
دہریوں تک کے یہاں یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے۔ اور وہ بھی فریضۂ
زندگی کا مقام یہی سمجھتے ہیں کہ وہ حالات کی سازگاریوں اور ناسازگاریوں
سے بے نیاز اور بہر صورت زندگی کے آخری سانس تک ایک سعیِ
پیہم کا مستحق ہے۔ چنانچہ ان کی تاریخ میں اس کے بے شمار شواہد پائے
جا سکتے ہیں۔

مارکس کے پیرو اس کے چند مخصوص نظریاتِ زندگی پر ایمان لائے
اور انہی نظریات کی "اقامت" میں انھوں نے مصائبِ انسانی کا علاج
یقین کیا، اس لیے یہی چیز ان کی زندگیوں کا نصب العین قرار پا گئی
اور انھوں نے اس کی ترویجِ عام کے لیے پوری قوت سے جہاد شروع
کر دیا۔ یہ جہاد اس مملکت میں شروع کیا گیا جس پر دنیا کی سب سے مستبد
حکومت مضبوطی سے اپنے پنجے گاڑے ہوئے تھی اور جہاں زار کی

کی مطلق العنانیت اور تمارت کے خلاف سانس لینا بھی بظاہر ممکن نہ تھا، مگر اشتراکی اصولوں پر معاشرہ اور حکومت کی تنظیم کو اپنا فریضۂ زندگی قرار دینے والوں نے ان مصائب و آلام کی طرف سے آنکھیں بند کرلیں جو اس جد و جہد کے پردے میں چھپے انھیں گھور رہے تھے، جب زار کے کانوں تک ان کی سرگرمیوں کی اطلاع پہونچی تو وہ تعذیب و ترہیب کے تمام اسلحوں سے مسلح ہو کر پوری خشمناکی کے ساتھ ان پر ٹوٹ پڑا، کتنوں ہی کو موت کے گھاٹ اتار دیا، جو موت کے چنگل سے بچے ان کو سائبیریا کے برفستانی جہنم میں جھونک دیا۔ ظلم اور ایذا دہی کی کوئی ایسی ممکن صورت نہ تھی جس سے ان کو سابقہ نہ پڑا ہو، سالہا سال تک یہی ہنگامۂ دار و گیر برپا رہا، مگر کوئی بڑے سے بڑا حادثہ ان کے پایۂ عزیمت میں لغزش نہ پیدا کر سکا، اور اشتراکیت کا عشق آلام و مصائب کے بیچ و دھارے سے ان کو تیرا تا اور منزلِ مقصود کی طرف ان کے قدم بڑھوا تا رہا۔

انہی اشتراکیوں میں، آگے چلکر، جبکہ وہ زار کا تختِ سلطنت الٹ کر اپنا اشتراکی نظام قائم کرنے میں کامیاب ہو چکے، باہم اختلاف ہو گیا لینن کی وفات کے بعد سیاست کی باگ ڈور، سٹالن کے ہاتھوں میں آگئی جس نے آہستہ آہستہ اشتراکی نظامِ سلطنت کو بین الاقوامیت کی سطح سے ہٹا کر قومی اشتراکیت کی سطح پر لانا شروع کیا۔ اس کی اس پالیسی سے جو در اصل اصولِ اشتراکیت سے صریح تجاوز اور ان کے ساتھ کھلی ہوئی غداری اور منافقت تھی، ٹراٹسکی نے اختلاف کیا اور اشتراکیت کی

اصلی روح کے قیام اور خالص مارکسیت کی بقا پر زور دیا، اسٹالن نے نہ صرف
اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا بلکہ اُس کو اس جرم کی پاداش میں
مجلس حل و عقد سے نکال باہر کیا، خفیہ پولیس نے اس کے اور اس
کے حواریوں کے منہ بند اور ہاتھ پاؤں باندھ دیئے، مگر وہ جن
اُصولوں کا عقیدت کیش تھا اور جن کے قیام و بقا میں اس کو خلائق
کی فلاح نظر آ رہی تھی، اُن کی تبلیغ سے باز نہ رہا۔ آخر کار جلا وطن کر دیا
گیا، امریکہ پہنچا اور وہاں سے اپنے خیالوں کی اشاعت کرنے لگا،
اور اپنے نصب العین کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے لگا۔ اس کے مشن کے
دشمن وہاں بھی پہونچے، اور ایک روز خفیہ سازشوں کے ذریعہ اس
کے سامنے موت کا پیالہ پیش کر دیا۔ اور مارکسیت کے اس "مومن قانت"
نے نہایت صبر و سکون کے ساتھ اس پیالہ کو قبول کر لیا۔

یہ تو کچھ پرانی باتیں ہیں، ذرا قریب آیئے، یہ جاپانی اور جرمن قومیں
جو زخموں سے چور آپ کے سامنے پڑی ہیں، ان کے رہنماؤں نے ان کے
سامنے ایک نصب العین رکھا، وہ اس پر ایمان لائیں، اور پھر اس
کے حصول کے لیے سرگرم عمل ہو گئیں، حریفوں نے آگا روکا، انھوں نے
سب لوگ شمشیر اسی روک کو دور کرنے کی ٹھان لی، میدان کارزار گرم ہو گیا
جمعیت و اتفاق کے چوپالے پٹا تو جلتی ہوئی قومیں پیچھے ہٹنے لگیں، مشکلات
اور مایوسیوں کے طوفان نے گھیر لیا، مگر اپنے مطاع مطلق کا جذبہ اطاعت
اور مطمح نظر کا عشق تھا کہ ان کے نوجوان موت کو منہ کھولے ہوئے دیکھتے

اور اس میں کود پڑتے، ہوائی جہازوں سے چھلانگ لگاتے اور بم لے کر سیدھے دشمن کے جنگی جہازوں کی چمنیوں میں جا گھستے، بموں سے لدا ہوا تیارہ جہاز ان بحری جہازوں پر جا گرتے؛ اور اس طرح دنیا کے جنگی لغت میں "خود کش ہوائی جہاز" اور "آدمی بردوش طیارے" کے حیرت خیز الفاظ کا اضافہ کر گئے۔ اور ایسا کہ قدرت نے ان کو اپنی آرزوؤں میں ناکام بنا دیا ہے وہ اس عقیدے کے ساتھ ہرا کری کر رہے ہیں کہ مرنے کے بعد دیوتا بنکر اپنی قوم کی خدمت اور اپنے مقصد کی خاطر جنگ کریں گے، اور ان کی عورتیں اپنے نوزائیدہ بچوں کی پرورش یہ کہکر شروع کرتی ہیں کہ یہ بڑے ہو کر اپنے دشمنوں اور عظمتِ قومی کے غارت گروں سے انتقام لیں گے۔

یہ ان لوگوں کے نظریے اور کارنامے ہیں جن کا کوئی مستقبل نہیں، جن کی قربانیوں کا انجام اپنی زندگی کے لئے خود اُن کے اپنے معتقدات کے مطابق معدوم محض ہے اور جن کے سامنے اگر کچھ ہے تو صرف اسی دنیا کے ذوق کے رذیل مقاصد ہیں۔ کیا ان واقعات اور حقائق میں ہمارے لئے کوئی درسِ عبرت ہے؟ کیا رضائے الٰہی اور سعادتِ ابدی کے حصول میں اتنی گرائی بھی نہیں جتنی ان حیوانی مقاصد کے حصول میں ہے؟ کیا ایمان باللہ میں اتنی حرارت بھی نہیں جتنی مومنین با لطاغوت کے دلوں میں سُلگ رہی ہے؟ کیا حق کی شہادت میں اتنی حمیت بھی نہیں دکھائی جا سکتی جتنی باطل کی شہادت میں آج ظاہر ہو رہی ہے؟ اور کیا فرضِ زندگی کو اتنی اہمیت بھی اہلِ اسلام دینے کو تیار نہیں جتنی یہ کفار دے رہے ہیں؟ انبیائے کرام کے واقعات کو

نفس حیلہ گر پیغمبرانہ جوشِ تبلیغ اور معجزہ اور تائیدِ روح القدس کا نتیجہ قرار دے کر ٹال سکتا ہے، مگر اہلِ کفر و ضلال کی ان سرفروشانہ مساعی کے پیچھے کس معجزہ کا سراغ پایا جائے گا۔ کاش ہم امکان و عدمِ امکان کی بحثیں شروع کرتے وقت باطل پرستوں ہی کے اعمال و اخلاق پر ایک نظر ڈال لیتے، اور انھیں سے مستعد زندگی کا سبق سیکھ لیتے۔ افسوس! کہ یہ منظر بھی کتنا عبرت ناک ہے وہ جن کی نظر ہی عالمِ آب و گل تک ہے، اور اس غرض میں فکرِ انجام سے اتنے بے پروا ہوں، اور وہ جن کا دعویٰ ہے کہ "ہماری نماز اور ہماری قربانی ہماری زندگی اور ہماری موت صرف اللہ کے لئے ہے" اندیشۂ ناکامی کی پرستش میں مصروف ہیں۔ جو نقش حقیقت ایک اندھا کافر بھی ہاتھوں سے ٹٹول کر معلوم کر لیتا ہے وہ ایمان کی روشنی رکھنے والی آنکھوں کو سجھائی نہیں دیتا۔

یہ عقلیت ہے جذبات پرستی نہیں گو یہ بات اپنی جگہ شک سے بالاتر ہے کہ ادائے فرض کے سلسلہ میں امکان کی بحث نہ صرف یہ کہ بے محل ہوتی بلکہ ایمان بالقرآن کا مزاج لطیف اس کے تصور تک کو برداشت نہیں کر سکتا، اور نہ صرف یہ کہ یہ طرزِ فکر غیر اسلامی ہے بلکہ کوئی غیور اور باحمیت کافر بھی اس کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں، مگر ہمیں اندیشہ ہے کہ یہ چیز اس وقت کے مصلحت پرست اور عافیت پسند دماغوں میں اتر نہیں سکتی، عقل و تدبر کے دعوے دار ایک طعن آمیز تبسم کے ساتھ بول اٹھیں گے کہ "یہ سب جذباتی باتیں ہیں جن کا دنیائے فکر و عقل سے کوئی تعلق نہیں۔" "اہلِ دانش" کے اس ریمارک کو ہم بھی بڑی خوش دلی کے ساتھ قبول کر لیتے، کیونکہ اتنا بڑا بارِ ذمہ داری اٹھانے اور اپنی پیر منتظر

راہ اختیار کرنے کا خواہ مخواہ کسی کو کوئی شوق نہیں ہے مگر دشواری یہ ہے کہ اس سے ہماری مشکل حل نہیں ہوتی، بلکہ اس میں مزید گرہیں پڑ جاتی ہیں۔ پھر وہی عقل جس کی دہائی دی جا رہی ہے، پکار کر پوچھتی ہے کہ ایسا دین قبول ہی کیوں کیا جائے جو بار بار اور تصریح کے ساتھ اس "جذباتی اصول" کی تعلیم دیتا ہو۔ اگر ایک شخص اس دین کی سچائی تسلیم کرتا اور اس کے اتباع کا عہد کرتا ہے، تو اس کو لازم ہے کہ دہکتے ہوئے الاؤ کے اندر بھی کود پڑنے میں کوئی لیس و پیش نہ کرے اگر اس کے دین کا اس سے یہ مطالبہ ہو۔ لیکن اگر اس کی تعلیمات اور اصول اس کی نگاہ میں جذباتی یعنی ناقابلِ عمل اور غیر معقول معلوم ہوتے ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس کی صداقت کا قائل ہی نہیں اور نہ اس پر ایمان رکھتا ہے۔ بلکہ اس کا ایمان اپنی عقل و فہم پر ہے اور ایمانداری کا تقاضا یہ ہے کہ اس دین کے نام سے اصول و مسائل پر بحث کرنے سے پہلے وہ اپنی پوزیشن کی تنقیح اور تعیین کر لے۔

لیکن کیا واقعۃً یہ بات جذباتی ہی ہے اور اس اصول کی بنیاد نرے جذبات ہی پر ہے؟ نیز کیا جذبات کا ہماری عملی زندگی میں کوئی دخل نہیں؟ ہر بالغ نظر انسان تھوڑے سے غور و فکر کے بعد اس حقیقت کو پا سکتا ہے کہ انسانی زندگی کی تعمیر اور رہنمائی سے ان دونوں میں سے کسی چیز کو بھی بے دخل نہیں کیا جا سکتا، یہ البتہ ہے کہ دونوں کے مخصوص اور متعین حدود و اختیارِ عمل ہیں، اور ایک کو دوسرے کے حلقۂ کار میں لے جانے کا مطلب اپنے آپ کو تباہی کے گڑھے میں پھینک دینا ہے۔ کسی مقصد کی تعیین تو تنہا عقل ہی کرتی ہے

اور وہ شخص بڑا ہی احمق ہوگا جو اپنے مقاصد کی تعیین میں جذبات کو بھی
رائے دہی کا مستحق گردانے، مگر جب عقل ایک نقشے کو گہرے سوچ بچار کے بعد
مقصدِ زندگی ٹھہرا دے تو پھر آگے عقلِ محض کے بس کا یہ کام نہیں کہ وہ اس منزلِ
مقصود کی طرف مطلوبہ رفتار سے قدموں کو بڑھا سکے، اس وقت وہ جذبات
کی دست نگر ہوتی ہے، اور یہی جذبات دلوں میں وہ کشش، قوتِ عمل اور قدموں
میں وہ جوشِ حرکت و اقدام پیدا کرتے ہیں جن کے بغیر منزل تک رسائی ناممکن ہے،
یہ جذبات نہ ہوں تو قوائے عمل سستِ خواب رہتے ہیں، اور بڑے سے بڑا مقصد بھی
ان کو جھنجھوڑ کر بیدار نہیں کر سکتا۔ عقل صرف سمتِ سفر مقرر کرتی اور انجن اور پٹری
تیار کرتی ہے، مگر اس انجن کو حرکت دینے والی اور منزلِ مقصود کی طرف
دوڑانے والی اسٹیم یہی جذبات ہی مہیا کرتے ہیں۔ جذبات نے انسانی زندگی
کی تعمیر میں اپنا یہ حق غاصبانہ طور پر نہیں حاصل کیا ہے بلکہ عقل ہی کا عطا کردہ اور
تسلیم شدہ ہے۔ یعنی جس طرح مقاصد کی تعیین میں جذبات سے کام نہ لینا عقلیت
ہے اسی طرح ان مقاصد کے حصول میں جذبات سے بیش از بیش کام لینا
بھی عقلیت ہے، جذباتیت نہیں ہے۔ اس لئے اسلام کو دینِ حق مان لینا
اور اس کے بعد اس کے مطالبات کو پورا کرنے میں لیت و لعل کرنا دانشمندی
نہیں بلکہ دانش فروشی ہے۔ عقل کا نام لے کر عقلیت کو رسوا کرنا ہے نیز احساس
کہتری، دون ہمتی، بے غیرتی اور ضعفِ عزم و ایمان کا کھلا ہوا اعتراف ہے۔

اسلام اور اقامتِ دین کا تلازم | اس تقریر سے جو اوپر گزر چکی، صرف اتنا ہی نہیں
ثابت ہوتا کہ اقامتِ دین کی جد و جہد، امکان و عدمِ امکان کی بحث سے

بالاتر ہے اور اس کو طوعاً یا کرہاً ہر وقت، ہر ماحول اور ہر حالت میں جاری رکھنا چاہیے، بلکہ اس سے یہ بھی واضح ہوگیا کہ اگر حالات کے اندازے اس جد و جہد کی ناکامی کا یقین دلادیں، حتیٰ کہ اگر کوئی اپنی آنکھوں سے نوشتۂ الٰہی میں اس ناکامی کو مقدر دیکھ لے تو بھی اس کو اس سعی سے جو اس کے نزدیک لاحاصل ہے، لگے رہنے کے بغیر چارہ نہیں، کیونکہ یہ دنیا کی عام تحریکوں اور اسکیموں کی طرح کی کوئی تحریک اور اسکیم نہیں ہے کہ اگر اس کی کامیابی کے ذرائع مفقود اور امکانات ناپید نظر آئیں تو اس کو ترک یا ملتوی کردینا جائز اور ممکن ہوسکے۔ نہ مسلمانوں کے سر پر کوئی اوپر سے چپکی ہوئی چیز ہے کہ چاہا تو قبول کرلیا اور جب چاہا اس کو اپنے پروگرام سے خارج کردیا، بلکہ ایک شخص کے مسلمان ہونے کا لازمی تقاضا ہی یہ ہے کہ اس نے اس دین کی اقامت کے لئے اپنے کو وقف کردیا ہے۔ اللہ پر ایمان لانے اور حق سے محبت کرنے کا فطری مطالبہ ہی یہ ہے کہ جو چیزیں خدا کو محبوب ہوں اور جو باتیں حق ہوں انسان ان کو اپنے گرد و پیش زندہ اور کارفرما دیکھے اور اس کے لئے ہمہ دم کوشاں رہے، اور ہر اس چیز کو مٹا دینے کے لئے تیغ بکف نظر آئے جو خدا کو ناپسند اور باطل ہوں، چنانچہ اوپر ہم واضح دلائل کے ساتھ یہ بیان کرچکے ہیں کہ جس طرح آگ اور پانی کا اتحاد ممکن نہیں اسی طرح ایمان اور منکرات میں مصالحت ممکن نہیں، پس یہ جد و جہد اسلام سے علیحدہ اور اس سے زائد کوئی چیز نہیں ہے بلکہ اس کی عین روح اور حرکت قلب ہے۔

اگر کسی جاندار کے متعلق یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ وہ زندہ تو ہو مگر اس
کے قلب میں حرکت نہ ہو تو یقین رکھئے کہ کسی انسان کے بارے میں بھی
یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ ہو تو وہ مومن مگر اقامت حق کی تڑپ سے اس
کے دل و دماغ خالی اور عملی جدوجہد سے اس کے دست و بازو نا آشنا
ہوں۔ اس جذبے اور جدوجہد سے محروم ہو کر یعنی اس مقصد زندگی سے
کنارہ کشی اختیار کر کے مسلمان کا وجود ہی بے معنی ہو جاتا ہے۔ یہی وہ
سنگ بنیاد ہے جس پر اسلامیت کا قصر تعمیر ہوتا ہے۔ اگر یہ پتھر بیچ
سے غائب ہو جائے تو پھر اس قصر کا وجود ہی ممکن نہیں۔ چنانچہ اہل کتاب
کے متعلق جنہوں نے اس مقصد زندگی کو فراموش کر رکھا تھا۔ قرآن
نے صاف صاف کہہ دیا کہ جب تک تم تورات اور انجیل کو قائم نہ کرو، تم
کسی اصل پر نہیں ہو اور تمہارا ملی وجود ایک وجود موہوم کے سوا کچھ نہیں۔
لَسْتُمْ عَلٰى شَيْءٍ حَتّٰى تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ
مِّنْ رَّبِّكُمْ۔ اس لیے یہ کہنا کہ اس زمانہ میں اقامت دین ناممکن ہے
گویا دوسرے لفظوں میں یہ کہنا ہے کہ اس زمانہ میں مسلمان ہونا ممکن
نہیں، اور حالات زمانہ کی ناسازگاری کے پیش نظر اقامت دین کی
جدوجہد کو ترک کرنے کے معنی یہ ہیں کہ خود اسلام ہی سے دست برداری
کی ٹھان لی جائے۔

غلطی افکار کا منبع | بظاہر یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوگی اور کتنے ہی ذکی الحس
لوگوں کو تو اس میں خارجیت کی بو محسوس ہونے لگے گی لیکن در اصل

یہ استعجاب و استنکار اس غلط ذہنیت کی پیداوار ہے جس سے
کامیابی و ناکامی کا مفہوم ہی اُلٹ کر رکھ دیا ہے اور جس کو یہ نہیں
معلوم کہ فریضۂ اقامتِ دین کے معنی کیا ہیں؟ اگر یہ ذہنیت تبدیل کر لی
جائے اور اس کو صحیح اسلامی قالب میں ڈھال لیا جائے تو پھر نہ تو
خطرات و مشکلات کا تصور اس کو پریشان کرے گا۔ نہ امکان اور
عدمِ امکان کا سوال پیدا ہو گا۔

ہماری اصل ذمہ داری | جب یہ کہا جاتا ہے کہ دین کی اقامت ہم پر فرض
ہے تو اس کا مطلب بالعموم یہ لیا جاتا ہے کہ زمین پر دین یعنی الٰہی نظام
زندگی کو بالفعل قائم اور نافذ کر دینا ہمارا فرض ہے، حالانکہ جو چیز ہم پر فرض
ہے اور جس کی ہم سے اللہ تعالیٰ کے یہاں باز پرس ہو گی وہ دین کو قائم
کر دینا نہیں ہے بلکہ اس کو قائم کر دینے کی امکانی جدوجہد کرنا ہے۔ اسی
طرح کامیابی کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہماری تگ و دو لازماً ایک خالص
اسلامی اسٹیٹ قائم کر دینے پر منتج ہو۔ بلکہ اس کا مطلب یہ بھی ہے،
بلکہ درحقیقت یہی ہے کہ ہم اس راہ میں اتنی جانفشانی، قربانی، فدائیت
اور سعی و جہد کر دکھائیں جو ہمارے بس میں ہو۔ جس نے یہ کر لیا وہ اپنے
مقصدِ زندگی کو پورا کر گیا اور اپنے مشن میں ہر طرح کامیاب رہا اگرچہ
ایک شخص نے بھی اس کی بات نہ مانی ہو، اور ایک ذرہ زمین پر بھی وہ
دینِ حق قائم کر دینے میں کامیاب نہ ہوا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان پر
اتنا ہی بوجھ ڈالا ہے جتنا وہ اُٹھا سکتا ہے لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا

وُسْعَهَا۔ اس نے کسی انسان کو ایسی بات کی تکلیف نہیں دی ہے جو اس کی فطری صلاحیتوں اور قوتوں سے زائد ہو۔ مثلاً اس نے ہم سے مطالبہ کیا ہے کہ تقویٰ اختیار کرو۔ مگر اس کا یہ مطالبہ ہماری فطری استطاعت سے بڑھکر اور غیر محدود نہیں ہے۔ بلکہ اسی حد تک ہے جتنا انسانی فطرت کے بس میں ہے۔ چنانچہ فرمایا:

اِتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ — اللہ کا تقویٰ اختیار کرو، جہاں تک تمہارے بس میں ہے۔ (تغابن۔۲)

مسلمانوں پر فرض کیا گیا ہے کہ وہ اعدائے دین کا مقابلہ کرنے اور ان کا زور توڑنے کے لئے تیار رہیں، مگر ان سے یہ مطالبہ نہیں کیا گیا ہے کہ جس طرح بھی ہو سکے دشمنوں کی قوت جنگ کے برابر قوت فراہم کریں، بلکہ صرف اتنا کہا گیا ہے کہ اور اتنا ہی ان پر واجب کیا گیا ہے کہ :-

أَعِدُّوا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ . الخ — دشمنوں کا مقابلہ کرنے کے لئے اتنی قوت تیار کر رکھو جتنی تم کر سکتے ہو۔ (انفال ۸)

ان آیات سے جو اصول ہاتھ آتا ہے وہ صرف یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی بجاآوری حدود استطاعت سے محدود ہے۔ پس اقامت دین کے معاملہ میں بھی حالات زمانہ، مشکلات راہ، ناسازگاری ماحول، قلت ذرائع، ان سب چیزوں کا الاؤنس انسان کو ملے گا۔ اور ان کے لحاظ سے مختلف انسانوں کی کوششوں میں نمایاں تفاوت ہو سکتا ہے اور ہونا چاہیئے۔ ہر انسان کو اللہ تعالیٰ کے روبرو صرف اسی حد تک جوابدہی

کرنی پڑے گی جس حد تک اس کو جدوجہد کرنے کی طاقت میسر ہے۔ اگر ایک شخص کو سامانِ کار اور سازگاری ماحول نصیب ہے لیکن اس نے اپنی طاقت سے بال برابر بھی کم جدوجہد کی تو یقیناً ادائے فرض کی کوتاہی کا مجرم قرار پائے گا، خواہ ظاہری نتائج کے اعتبار سے اس راہ میں وہ دوسروں سے کتنا ہی آگے کیوں نہ نکل گیا ہو، بخلاف اس کے اگر ایک انسان نے اپنی تمام ممکن کوششیں صرف کر ڈالیں لیکن سروسامانِ کار کے نا پید اور حالات کے نا موافق ہونے کے باعث آخر تک منزلِ مقصود کی طرف ایک قدم بھی نہ بڑھ سکے وہیں کا وہیں کھڑا رہ گیا جہاں سے اس نے اپنی مہم کا آغاز کیا تھا تو وہ ہر طرح سے اپنے فرض کو ادا کر گیا۔ غرض انسان کو چاہیے کہ جن حالات میں جیسی کچھ قوت بھی حاصل ہوتی جائے اپنی جدوجہد کا دائرہ اسی لحاظ سے تنگ یا وسیع کرتا رہے۔ اس چیز کو ایک عام مثال سے سمجھئے۔ نماز انسان پر فرض ہے اس میں قیام و رکوع و سجود بھی فرض ہیں، ایک شخص اگر قیام پر قادر ہونے کے باوجود بیٹھ کر نماز پڑھتا ہے تو اس کی نماز نہیں ہوتی، اور اگر کسی واقعی مجبوری کی وجہ سے وہ بیٹھ کر نماز پڑھ رہا ہو اور دو رکعتیں پڑھ چکنے کے بعد اس کی مجبوری دور ہو جاتی ہو، اور اب وہ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے پر قادر ہو گیا ہو لیکن اس کے باوجود بیٹھا نماز پڑھتا رہے، تو اس کی نماز نہ ہوگی۔ بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ جیسے ہی اس کو زوالِ عذر اور قدرتِ قیام کا احساس ہو، فوراً کھڑا ہو کر نماز پڑھنے لگے۔ بالکل

یہی حال اقامت دین کی جدوجہد کا بھی ہے۔ جس شخص کو جس وقت جتنی قوت میسر ہو اُس وقت اُتنی قوت صرف کرنا اُس کے لئے ضروری ہے اس سے زیادہ کا وہ مکلف نہیں اور نہ اس سے کم میں اس کی خیر ہے۔ زمین پر مکمل طور پر اللہ کے دین کو بالفعل قائم اور نافذ کر دینا ایک آخری غایت (Goal) ہے۔ جہاں تک پہونچنے کی ہر مسلمان کو دعوت دی گئی ہے، مگر وہاں بہر صورت پہنچ جانا واجب نہیں قرار دیا گیا ہے، جو کچھ واجب ہے وہ یہ کہ اس منزل کی طرف اتنے قدم آگے بڑھو جتنے بڑھ سکتے ہو۔

ناکامی ناممکن ہے | جب اقامت دین کی فرضیت کا مدعا یہ ہے تو یہ کہنا کتنی بڑی نادانی ہے کہ چونکہ بحالت موجودہ کامیابی کا کوئی امکان نہیں اس لیے ہم اس جدوجہد کو اختیار نہیں کر سکتے۔ جب اپنی استطاعت کے مطابق کوشش کرنے کی حد ہی تک ہم مکلف ہیں تو پھر اس راہ میں ناکامی کا کیا سوال ہے۔ دنیا کی تمام تحریکوں اور سرگرمیوں میں کامرانی اور ناکامی دونوں کا امکان ہوتا ہے، لیکن اگر کوئی جدوجہد ایسی ہے جس میں ناکامی کا کوئی امکان نہیں تو یہی اقامت دین کی جدوجہد ہے جس میں بدقسمتی سے ہم کو ہر طرف ناکامی ہی ناکامی نظر آتی ہے۔ حالانکہ اس راہ میں اگر کوئی ناکامی ہے تو صرف یہی کہ اپنی قوتوں کو اس میں خرچ کرنے سے دریغ کیا جائے، اور اپنی استطاعت کے مطابق کلمۂ حق کی سربلندی میں سعی نہ کی جائے۔ اس کے علاوہ کسی

کسی ناکامی کا خدشہ نہیں۔ اس راہ کے چلنے تمام راہوں سے نیارے ہیں اور معیارِ کامرانی تمام معیاروں سے جدا ہے۔ مومن اپنی قوتیں میدان سعی وجہد میں ڈال دینے کے بعد جس انجام سے بھی دوچار ہوتا ہے وہ بہرحال فتحمندی و کامرانی ہے، مایوسی و نامرادی کے تو نام سے بھی اس کی جدوجہد آشنا نہیں۔

کامیابی کا اسلامی تصور اس بارے میں جو چیز مسلمانوں کی نگاہوں کا حجاب بن گئی ہے وہ اشیاء کی قدریں متعین کرنے کا وہ مادی اصول ہے جو آج ہر چہار سو چھایا ہوا ہے۔ لیکن جس کو قرآن مٹانا چاہتا ہے۔ آج مسلمان کسی چیز کے رد و قبول میں اسی عالم کے منافع و مضار کو سامنے رکھتا ہے اسی لیے اس سعی و کوشش کو لاحاصل اور ناکام سمجھتا ہے جس کا کوئی فوری اور مادی فائدہ ظاہر ہوتا ہوا دکھائی نہ دے۔ لیکن قرآن نجاح اور سعادت کا نشان بالکل مخالف سمت میں بتاتا ہے، وہ مسلمان کی امتیازی خصوصیت یہ بتاتا ہے کہ وہ آخرت کے مفاد کو دنیا کے مفاد پر ترجیح دینے والا ہے۔ نیز وہ انسان کی کامیابی یہ قرار دیتا ہے کہ وہ اپنی تمام کوششوں کو راہِ حق اور تلاشِ رضائے الٰہی میں لگا دے۔ اب اگر وہ پہلے ہی قدم پر اپنا سب کچھ کھو بیٹھتا ہے تو بھی، اور اگر سارے عالم پر دینِ حق کا جھنڈا لہرا دے تو بھی، ہر حال میں کامیاب ہے۔

منافقوں کی تمنا بھی تھی اور توقع بھی کہ اب یہ جو روم کے افق سے طوفانِ جنگ نمودار ہو رہا ہے۔ ان مٹھی بھر مسلمانوں کو جو تمام دنیا کو

دشمن بنائے بیٹھے ہیں، اپنی لپیٹ میں لے لے گا۔ اور ان کی یہ ساری شان و شوکت ناکامی و نامرادی کی قبر میں دفن ہو جائے گی۔ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر کو حکم دیا کہ:

قُلْ هَلْ تَرَبَّصُوْنَ بِنَآ اِلَّآ اِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ (توبہ) — ان منافقوں سے کہہ دو کہ تم ہمارے حق میں جس بات کا انتظار کرتے ہو، وہ ہمارے لئے دو بھلائیوں میں سے ایک بھلائی ہی تو ہے۔

دیکھا آپ نے کہ جس طرح مسلمانوں کی فتح بھلائی اور کامیابی ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ ان کی شکست کو بھی "احدی الحسنیین" کہہ کر اسی کے برابر کامیابی قرار دے رہا ہے۔ فتح بھی "حسنیٰ" ہے اور شکست بھی۔ گویا ایک مرد مومن جب جہاد فی سبیل اللہ کے لئے گھر سے نکلتا ہے تو بہر صورت تحفۂ کامرانی لے کر ہی لوٹتا ہے۔ بے شک یہ کامیابی بہت بڑی کامیابی ہے کہ وہ اپنی تلوار سے دشمنوں کو زیر کر لے اور حق کا بول بالا کر دے۔ مگر اس کے برعکس اگر وہ اور اس کے تمام ساتھی میدان جنگ میں قتل ہو جائیں تو جہاں تک ادائے فرض کا تعلق ہے، یہ بھی اسی کے ہم پلہ ایک کامیابی ہے، قابل صد رشک کامیابی! ایسی کامیابی جس پہ دنیا کی ساری کامیابیاں اور تمام سعادات قربان ہو جائیں! جس سے بڑی کامیابی کی کوئی ذہنی نہیں کی جا سکتی۔

یہ ایک جزئی مثال تھی جس کا تعلق مومن کی زندگی کے صرف ایک مخصوص گوشہ سے ہے۔ اسی جزء سے کل کی طرف آئیے اور اسی

فرع کو اصل بنا کر مومن کی ساری مساعی حیات یعنی مساعی اقامت دین پر پھیلا دیجئے۔ پھر معلوم ہو گا کہ حضرت یحییٰ علیہ السلام جن کو دعوت حق دینے کے جرم میں دار پر لٹکا دیا گیا، اور جو ایک بالشت زمین پر بھی دین حق قائم نہ کر سکے، اللہ تعالیٰ کی نگاہوں میں ٹھیک اسی طرح دنیا سے کامران و بامراد تشریف لے گئے جس طرح محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جنھوں نے ایک وسیع خطۂ ارض پر عملاً اللہ کا دین قائم کر دیا تھا۔ مگر اس راز کو سمجھنے اور قبول کرنے کے لئے مومن کا دل چاہیئے، عقل مصلحت پرست کے اندر یہ "جذباتی" باتیں کہاں سما سکتی ہیں۔

قیام دین کے روشن امکانات | لیکن کامیابی کا جو مفہوم عام طور پر لیا جاتا ہے، اس کے لحاظ سے بھی ہم پورے وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ آج کی دنیا میں اس جدوجہد کی ناکامی کی بہ نسبت کامیابی کا زیادہ امکان ہے، اور اگر اس کو اس کے مزاج کے موافق طریقوں پر پوری سرگرمی سے جاری رکھا گیا، جس کی توضیح ہم آگے چل کر کریں گے، تو اس کا بارآور ہونا اسی طرح یقینی ہے جس طرح شب تار کے بعد آفتاب عالم تاب کا طلوع۔ اس دعوے کے اثبات کے لئے آپ کو عام انسانی فطرت، دنیا کے تمدنی مسائل، تہذیب حاضرہ کے پیدا کئے ہوئے عمل طلب معاملات اور حق کی ساحرانہ قوت واثر و نفوذ پر ایک گہری نظر ڈالنی چاہیئے۔ اور سب سے اول اور آخر اس چیز پر کہ مسئول و مخاطب کون لوگ ہیں؟

عموماً لوگ کامیابی کے امکانات کا اندازہ لگاتے وقت پہلے ہی

قدم پر ایک عظیم الشان حقیقت فراموش کر جاتے ہیں، کہ اس کا مطالبہ کسی گری پڑی جماعت اور بے اصول، خود غرض، دنی الاخلاق اور پست نظر لوگوں سے نہیں کیا جا رہا ہے۔ بلکہ ان لوگوں سے کیا جاتا ہے جو مومن ہونے کا دعوےٰ رکھتے ہیں، اور مومن کی جو ضروری صفات قرآن میں بیان ہوئی ہیں ان کا اجمالی خاکہ یہ ہے کہ وہ ایک خدا پر ایمان رکھنے والے ہوتے ہیں، اس کے سوا کسی کو معبود و مستعان اور صاحب حکم و امر نہیں سمجھتے، محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو اپنا ہادی مانتے ہیں، اور اپنی زندگی کے کسی شعبہ میں ان کے سوا کسی کو قابلِ اتباع نہیں تسلیم کرتے، وہ نماز روزے اور حج و زکوٰۃ وغیرہ عبادات کے بجا لانے والے ہوتے ہیں، حق کے شاہد، سچائی کے مجاہد، معروف کے مبلغ، عدل و قسط کے علمبردار باطل کے غداری دشمن، منکر کے دائمی محارب، جھوٹ سے متنفر، ظلم سے مجتنب ہوتے ہیں۔ برائی کو نیکی سے اور جہالت کو شرافت سے مٹانا ان کا شیوہ ہے۔ عدل پر قائم رہنا ان کا شعار ہے اگرچہ اس کی زد خود اپنے ہی اوپر کیوں نہ پڑتی ہو۔ دشمن کے ساتھ بھی رحم و انصاف کرنے پر مجبور ہیں اگرچہ کتنے ہی مظالم ان کے ہاتھوں جھیل چکے ہوں، ہر حال میں راہ راست پر قائم رہنے والے ہیں، اگرچہ تمام دنیا ہاتھ سے نکل جاتی ہو۔ پھر دوسروں کی عزت کو اپنی عزت سمجھنے والے، اور دوسروں کے جان اور مال کو حرمت کعبہ کا مستحق سمجھنے والے ہیں۔ جو اپنے لئے پسند کرتے ہیں وہی دوسروں کے لئے پسند کرتے ہیں۔ ان کے ہاتھ اور ان کی زبان سے کسی کو گزند

نہیں پہونچتا، خود ننگے اور بھوکے رہکر غریبوں کو کھلانے پلانے میں فرحت محسوس کرتے ہیں۔ یتیموں، بیواؤں اور کمزوروں کے لئے ان کے دامن پناہ گاہ ہیں اور ان کی زندگی، ان کی موت، ان کی محبت، ان کی عداوت سب اللہ کے لئے ہوتی ہے۔"

کم و بیش اسی قسم کے اوصاف کے حامل مومن کہلاتے ہیں۔ اس بات کی سخت ضرورت ہے کہ جب اقامتِ دین کے امکانات پر غور و فکر کیا جائے تو اس گروہ کو سامنے رکھکر غور کیا جائے، اس چیز کو نظر انداز کرکے کبھی صحیح نقطۂ نظر نہیں اختیار کیا جا سکتا۔ اس دور میں بھی جب ایمان و دیانت کا شدید ترین قحط ہے، ایسے لوگ نایاب نہیں ہیں اگرچہ کمیاب ضرور ہیں، اس لئے جہاں تک ایسے لوگوں کے وجود کا تعلق ہے ہم اطمینان رکھ سکتے ہیں۔

اس کے بعد دوسری چیز جو قابلِ توجہ ہے وہ انسان کی فطرت ہے، اس سلسلہ میں یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیئے کہ باعتبارِ فطرت انسان خیر پسند ہے اور ایک قلیل تعداد کو چھوڑکر ساری نوعِ انسانی نیکی کی مقناطیسیت سے کھینچ اٹھنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ خالص باطل پرست اور شر پسند لوگ دنیا میں بہت تھوڑے ہوتے ہیں۔ البتہ جب یہی گنتی کے شیاطین انسانی مستقبل پر قابض ہو جائیں اور اہلِ دنیا کی زمامِ قیادت ان کے ہاتھوں میں چلی جائے تو عام لوگ ان کے پیچھے چل پڑنے کی وجہ سے بدی کی نجاستوں میں آلودہ ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر نظری اور عملی دونوں حیثیتوں سے نورِ حق

ان کے سامنے بے حجاب کرکے چمکا دیا جائے تو فطرتِ انسانی کا فیصلہ یہی ہے کہ وہ اس کو قبول کرلے گی، اور کوئی وجہ نہیں کہ انسان اس چیز کو اس کے اپنے پورے حسن و جمال کے ساتھ دیکھنے کے باوجود رد کردے جو اس کی فطرت کو مطلوب ہے۔ اور اس چیز سے لپٹا رہے جس سے اس کی اصل فطرت ہم آہنگ نہیں۔ پچھلے زمانوں میں ایک تو انسانی عقل اپنی پختگی کو پہنچی نہیں تھی، دوسرے لوگوں میں گروہی اور مذہبی عصبیتیں حد سے زیادہ ہوتی تھیں، اور وہ اپنے دلوں کے دروازے ہر صدائے نامانوس کے لیے مضبوطی سے بند رکھتے تھے، تیسرے تبلیغ و اشاعتِ حق کے ذرائع نہایت محدود تھے۔ ان اسباب کی بنا پر دینِ حق کی تبلیغ کے نتائج اکثر ناکامی کی شکل میں نمودار ہوتے، مگر اب حالات بالکل بدلے ہوئے ہیں۔ انسان تحکمی عقائد کی اندھی پیروی سے باغی ہوکر اور اوہام پرستی سے متنفر ہوکر روز بروز حقائق پسندی کی طرف آرہا ہے۔ عقلیں ان اصول و نظریات کو چھانٹ کر دور پھینکتی جارہی ہیں جو انسانی زندگی کے مسائل کو تسلی بخش طور پر حل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ مغربی تہذیب اور حریتِ فکر و رائے نے جہاں دنیا کے بے شمار نقصانات سے دوچار کرادیا وہاں ایک ایسی چیز بھی پیدا کردی ہے جس سے ایک ایسے دین کو آئندہ چل کر عظیم الشان فوائد حاصل ہونے کی توقع ہے، جو مسائلِ زندگی کا صحیح، متوازن اور اطمینان بخش حل پیش کرسکے۔ اس تہذیب نے ان اوہام کی بنیاد ڈھادی ہے جو انسانی دماغ کا پردہ بنے ہوئے تھے۔

ان اوہام کے ڈھ جانے کے ساتھ ہی اُن مذاہب کی چھتیں بھی زمین
پر آ رہیں جن کی تعمیر ان اوہام پر ہوئی تھی۔ اور جو صرف جذباتی عصبیتوں کے
حصار میں ہی بچ سکتے تھے۔ یہ ایک انقلاب تھا، انقلاب کی فطرت ہمیشہ
ہیجانی ہوتی ہے۔ اس لیے یہ انقلاب بھی اپنے جوش میں اوہام کے
ساتھ بہت سے حقائق کو بھی بہا لے گیا۔ اور دیگر مذاہب کی طرح
خود اسلام کو بھی چیلنج کر گیا جو اپنی فطریت اور عقلیت کی وجہ سے
اس کا صحیح رہنما ہو سکتا ہے۔ مگر اس بے اعتدالی کے تلخ نتائج اب اس
کے علمبرداروں کے سامنے آ چکے ہیں، اور وہ اعتدال کی طرف لوٹ رہے
ہیں۔ اس انقلاب نے ذہنیتوں میں جو بھونچال پیدا کر دیا ہے اس
کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس نے جاہلانہ مذہبی عصبیتوں کی بندشیں
ڈھیلی کر کے بڑی حد تک قبولِ حق کی راہ صاف کر دی ہے۔ اور ایسے
بے شمار افراد پیدا کر دیے ہیں جو کسی ایسی بات کے تسلیم کرنے میں اپنے
روایتی معتقدات کو ذرا بھی مانع نہیں سمجھتے جس کی حقانیت ان کے
دلوں کو اپیل کر سکے۔ عقل و ذہن کی اس بے تعصبی کے علاوہ تاریخی
حقائق بھی کچھ کم قابلِ اعتنا نہیں ہیں جب سے نظامِ عالم کی سیاسی
باگ ڈور فاسق و فاجر اور خدا سے باغی ہاتھوں میں آئی ہے اور انھوں نے
ہدایتِ الٰہی کو پسِ پشت ڈال کر اپنے ذہن و دماغ کے بنائے ہوئے
اصولوں پر نظامِ زندگی کو چلایا ہے، اس وقت سے برابر یہ نوعِ انسان
اپنی خود سری کے بُرے نتائج بھگتتی چلی آ رہی ہے اور انسانی دماغ کے

بنائے ہوئے تمام نظام زندگی ایک ایک کرکے ناکام ثابت ہو چکے ہیں نہ صرف ناکام ثابت ہو چکے ہیں، بلکہ ان کی پیدا کی ہوئی پیچیدگیوں اور ان کی نازل کی ہوئی ہلاکتوں سے دنیائے انسانیت چیخ اُٹھی ہے اور بڑی بے تابی سے ایک ایسے نظام حیات کی طلبگار ہے جو اس کے دُکھوں کا مداوا ہو سکے۔

جب حالات یہ ہیں تو ڈرنے سہمنے اور مایوس ہونے کے بجائے ان لوگوں کو نہایت خوش دلی اور بیباکی سے ان کا خیر مقدم کرنا چاہیئے جو فی الواقع اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ حق صرف اسلام کے پاس ہے، عقل انسانی کو مطمئن کرنے، اور مسائل زندگی کو تسلی بخش طریقہ پر حل کرنے کی صلاحیت صرف تعلیمات قرآن ہی میں ہے۔ اس درد کا درماں صرف دین فطرت میں ہے جس سے آج سارا عالم انسانی تڑپ رہا ہے اور وہ آب زلال صرف سرچشمۂ محمدی ہی میں ہے جو دنیا کی تلخ کامی کو دور اور اس کے پیاسے جگر کو سیراب کر سکتا ہے۔ جن لوگوں نے ان باتوں کو محض موروثی عقیدت کی وجہ سے مان رکھا ہے ان کے متعلق تو ہم جانتے ہیں کہ وہ ان باتوں پر اسی طرح "داد" دے کر خاموش ہو رہیں گے جس طرح کسی اچھے اور خوش کلام شاعر کو اس کے معتقدین دیا کرتے ہیں، ایسے لوگ دین حق کے قیام سے مایوس ہی ہیں اور رہیں گے اور خدا کا دین بھی ان سے مایوس ہے۔ مگر ان لوگوں کے لئے مایوسی کی کوئی وجہ نہیں جو دین حق کے ان اوصاف و حقائق پر اپنی عقل اور بصیرت کے

ساتھ ایمان رکھتے ہیں، وہ جانتے ہیں، اور اگر نہیں جانتے تو ان کو جان لینا چاہئے کہ ان حالات میں اگر قرآن کے پیروؤں، اور اللہ تعالیٰ سے حق کی شہادت دینے کا عہد و پیمان کرنے والے "مومنوں" نے جن کی تعداد بفضلِ الٰہی مایوس کن نہیں ہے، اپنے فرائض کو ٹھیک ٹھیک پہچان لیا، اور خلق کے سامنے حق کی اس طرح تبیین کی جیسی کہ کرنی چاہئیے یعنی اگر انھوں نے اسلام کے اصول و نظریات کو جدید طرز استدلال اور سائنٹفک دلائل سے مدلل کر کے دنیا کے سامنے پیش کیا اور قوانین الٰہی کو زمانۂ حال کی تعبیروں میں ڈھال کر اور مسائل حاضرہ پر ان کو منطبق کر کے لوگوں پر واضح کر دیا کہ انسانی ضروریات کا صحیح حل اور تمدن عالم کی صحیح رہنمائی صرف الٰہی قوانین کر سکتے ہیں۔ پھر اگر انھوں نے اس کے ساتھ شہادتِ حق کا عملی نمونہ اس طرح پیش کیا کہ مشکل سے مشکل حالات میں بھی اسلام کی راہِ راست سے ان کا قدم نہ ہٹا، اگر انھوں نے عبادات اسلامی کو بجا لا کر اپنی سیرتوں کی تعمیر کر لی، اگر وہ انفرادی مسائل اور اجتماعی معاملات دونوں میں اسلامی اخلاق پر پوری استقامت کے ساتھ جمے رہے اگر انھوں نے قومی، وطنی، نسلی، خاندانی، طبقاتی اور ذاتی مفادات سے آنکھیں بند کر کے صرف اسلام کے مفاد کو اپنے سامنے رکھا، اگر انھوں نے ظلم کا جواب عدل سے، تعدی کا جواب قسط سے، بدی کا جواب نیکی سے، جھوٹ کا جواب سچ سے، مکر و فریب کا جواب وفائے عہد اور حسن معاملت سے، اور انتقام کا جواب رحم و انصاف سے دیا، اگر انھوں نے اپنے عمل سے

یہ ثابت کر دیا کہ ان کی سعی و جہد کا محرک صرف ان اصولوں کی تبلیغ و اقامت ہے جن میں ان کے نزدیک ساری نوعِ انسانی کی فلاح ہے۔ اور اگر انھوں نے اس سعی و جہد میں حسبِ ضرورت عیش و آرام کو خیرباد کہنے اور اپنی آرزوؤں کو پامال کرنے، تباہیاں اور بربادیاں خریدنے اور نقدِ جان و مال کی قربانیاں دینے میں اتنی ہی استقامت دکھائی جتنی کمیونسٹوں نے کمیونزم کی اقامت میں، جرمنوں نے نازیت کی حمایت و سربلندی میں، اور جاپانیوں نے میکاڈو کی رضا جوئی میں دکھائی ہے، تو حق کی ساحرانہ قوتِ تسخیر کا دعویٰ ہے اور خدا کی سنت اس دعوے کی گواہ ہے کہ یہ جد و جہد کامیاب ہو کر رہے گی، اور دنیا اپنے آپ کو مفتوحیت کے لیے از خود پیش کر دے گی۔ دل اس کی طرف کھنچ آئیں گے، ذہنوں کے تعصبات کافور ہو جائیں گے، اور آنکھیں اس کی طرف فرطِ عقیدت سے جھک پڑیں گی۔ اور دنیا از سرِ نو یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا کے روح پرور مناظر دیکھ لے گی۔ ہم جانتے ہیں کہ آج خدا کی پوری زمین پر باطل کی مضبوط گرفت قائم ہے، مگر ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ باطل اپنے ابدی اقتدار کا وثیقہ لے کر نہیں آیا ہے، نہ وہ اس زمین کا جائز وارث ہے۔ قدرت نے زمین کو حق کا مسکن بنایا ہے، جب حق اپنے علمبرداروں کی فرض ناشناسیوں کی وجہ سے اس گھر کو چھوڑ دیتا ہے تو دیوِ باطل اس خانۂ خالی پر مسلط ہو جاتا ہے، مگر جب بھی اس گھر کا اصلی مالک اپنی جگہ لینا چاہتا ہے تو قدرت کے مخفی ہاتھ اس غاصب کو نکال باہر کرتے ہیں

یہ ایک اصول ہے جس کی بنیاد کسی خوش گمانی پر نہیں ہے بلکہ قرآن کے بیان کے مطابق اللہ تعالیٰ کی ان سنتوں میں سے ایک سنت ہے جن میں کبھی کوئی تغیر نہیں ہوتا۔ چنانچہ فرمایا :-

جاءَ الحق وزھق الباطل حق آگیا اور باطل مٹ گیا، اصل یہ ہے کہ ان الباطل کان زھوقا (بنی اسرائیل) باطل مٹنے ہی والی شئے ہے۔

پس باطل کی زندگی صرف حق کی غیر موجودگی تک ہے، جب حق آئیگا، آئے گا نہیں بلکہ لانے والے اس کو لائیں گے تو باطل خود جگہ چھوڑ دے گا۔ یہ گمان کرنا خدا پر بہتان لگانا ہے کہ مطلوبہ کوششوں کے باوجود حق کا قیام ممکن نہیں، جو خدا اس باطل کے لئے کی ہوئی قربانیوں کو بھی کامیاب بناتا ہے جو اس کا مبغوض ہے، کیا آپ سمجھتے ہیں کہ وہ اس حق کی خاطر کی ہوئی قربانیوں کو رائیگاں جانے دیگا۔ جو اس کو محبوب ہے؟ حالانکہ اس نے وعدہ کیا ہے کہ "جو میرے دین کی مدد کرتا ہے میں اس کی مدد کرتا ہوں۔" اور قرآن نے ہم کو یقین دلایا ہے کہ خدا کی پارٹی ہزیمت نہیں اٹھاتی۔ وہ دشمن کے بالمقابل ہوتی ہے تو اس کی غیبی نصرتیں اور مافوق العادۃ اعانتیں اس کی پشت پناہ ہوتی ہیں، یہاں تک کہ آسمان کے فرشتے اس کے پہلو بہ پہلو لڑنے کے لئے آتر آتے ہیں، اور وہ اپنے سے دس گنے دشمنوں پر بھی غالب آکر رہتے ہیں، سو یقین رکھنا چاہیئے۔ جو فرشتے بدر و احد کے میدانوں میں آئے تھے وہ یہاں بھی آسکتے ہیں اور قرآن بتاتا ہے کہ خدا کے منارے اور حق کے

تھا، وہ جب چاہیں ان کو بلا سکتے ہیں۔ چنانچہ جب غزوۂ بدر کے موقع پر نزولِ ملائکہ کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ نے اپنی تائید خاص اور نصرت غیبی کا اظہار فرمایا تو ساتھ ہی اس شبہہ کو بھی رفع کر دیا کہ یہ نصرت خاص محض وقتی تھی اور کھول کر بتا دیا کہ "وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ" فتح و نصرت کی زمام اقتدار خدا ہی کے ہاتھ میں ہے، اور جس طرح آج ہے، کل بھی رہے گی، اس لئے کبھی، کسی زمانہ میں بھی، اہل ایمان کو اس تائید و نصرت سے مایوس نہیں ہونا چاہئیے۔ یاس و قنوطیت اہل ایمان کے نہیں بلکہ اہل کفر کے خصائص میں سے ہے اور خدا کے ان وعدوں کو، جن کا اوپر ذکر ہو چکا ہے، شک اور تردد کی نگاہ سے دیکھنا اس گروہ میں شامل ہونا ہے جس کے متعلق قرآن میں آیا ہے کہ یَظُنُّوْنَ بِاللّٰہِ غَیْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاھِلِیَّۃِ (یہ لوگ خدا کے متعلق خلاف حق اور جاہلانہ گمان کرتے ہیں) ہر مسلمان کو اس گروہ میں شامل ہونے سے خدا کی پناہ مانگنی چاہئیے، اور اگر قرآن پر واقعی ایمان رکھتا ہے تو اس کو کبھی بھی اللہ تعالیٰ کے یہ وعدے بھولنے نہیں چاہئیں کہ:-

مَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّہٗ مِنْ اَمْرِہٖ یُسْرًا (طلاق-۱۰) جو خدا ترسی کی راہ چلتا ہے خدا اس کے ہر معاملہ میں آسانی پیدا کر دیتا ہے۔

مَنْ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجْعَلْ لَّہٗ مَخْرَجًا وَّیَرْزُقْہُ مِنْ حَیْثُ لَا یَحْتَسِبُ وَمَنْ یَّتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ فَھُوَ حَسْبُہٗ جو شخص تقویٰ اختیار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے لئے (مشکلات اور نقصانات سے) نجات کی راہ پیدا کر دیتا ہے، اور اس کو ایسی جگہ

سے رزق پہنچاتا ہے جہاں کا اُسکو گمان بھی
نہیں ہوتا۔ اور جو کوئی اللہ پر توکل رکھتا ہے اُس
(کی کل مشکلات) کے لئے اللہ کافی ہے۔

اور سب سے آخر میں یہ کہ:—

الَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا (عنکبوت) جو لوگ ہماری راہ میں سعی و جہد کرتے ہیں ہم اُن پر اپنی راہیں ضرور کھول دیتے ہیں۔

ان حقیقتوں کے پیش نظر کسی صاحبِ فکر کا قیامِ دین کو ناممکن کہنا قلب و نظر کی بے بصیرتی، اور ادائے فرض کی مشکلات سے بزدلانہ فرار کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے، بالفرض اگر حالاتِ حاضرہ عدم امکانِ کامیابی کو مستلزم ہیں تو پھر ذرا ان حالات کی نشان دہی کی جائے جن میں کامیابی کا امکان ہو۔ مستقبل کے پردے میں کیا کچھ چھپا ہوا ہے، اس کا علم تو خدا ہی کو ہے، مگر ماضی کے احوال و مناظر تو قوتِ حافظہ کی مدد سے پردۂ حال پر لائے جا سکتے ہیں، ان احوال کو نگاہِ تعمق سے دیکھئے اور پھر بتائیے کہ تاریخِ انسانی کے اس پورے سلسلہ میں جو آدم سے شروع ہو کر آج ختم ہوتا ہے، قیامِ دین کے لئے جتنی کوششیں کی گئیں کیا ان سب کے زمانے اس جد و جہد کے لئے آج کی بہ نسبت لازماً زیادہ سازگار تھے؟ کیا حضرت نوحؑ کا زمانہ، جب کہ ساڑھے نو سو برس تک ان پر گالیوں اور پتھروں کی بارش ہوتی رہی، یا حضرت ابراہیمؑ کا زمانہ جس میں نمرود

کی خدائی قائم تھی، یا حضرت عیسیٰؑ کا زمانہ، جس میں ہر چہار طرف رومن امپائر کی طاغوتیت چھائی ہوئی تھی، یا حضرت یحییٰؑ کا زمانہ، جبکہ یہودی شیطان ہر صدائے حق کا جواب قتل اور صلیب سے دیا کرتے تھے، یا پیغمبر آخر الزماںؐ کا زمانہ، جبکہ خود مرکزِ حق تین سو ساٹھ بتوں کا مسکن اور جاہلیت کا دار السلطنت بنا ہوا تھا، یا مجدد الفؒ ثانی کا زمانہ، جبکہ "مسلمان" حکومت اسلام کے خلاف اپنا سارا زور صرف کر رہی تھی، یا سید احمد بریلویؒ کا زمانہ، جبکہ اہلِ اسلام کے سینوں پر ایک طرف انگریز اور دوسری طرف سکھ سوار تھے، زمانہ حال کے مقابلہ میں زیادہ سازگار تھے؟ ہم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان میں سے ہر زمانہ قیامِ دین کے لئے اس سے کہیں زیادہ پرخطر اور مایوس کن اور ناسازگار تھا، جتنا آج ہے۔ پس اگر مشکلات وموانع کا لحاظ کیا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ آغازِ آفرینش سے اب تک ایک فیصدی دور بھی ایسے نہیں آئے، بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ کوئی دور بھی نہیں آیا جو اس جد وجہد کے لئے سازگار رہا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ کہ ایسے سخت زمانوں اور نامساعد حالات میں بھی کتنی ہی کوششیں کامیاب ہو گئیں۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ ہم نے دنیا جہان کی ناکامیاں اسی زمانہ کے لئے کیوں مقدر مان لی ہیں، اور ساری مایوسیوں کو اپنے ہی لئے کیوں مخصوص سمجھ لیا ہے؟

پھر دوسری بات یہ کہ جب ہم نے ادھر سوا سو سال سے اس مقصد کے لئے کبھی براہِ راست تگ ودو کی ہی نہیں تو آخر کس تجربہ کی بنا پر نا ممکن

کا ہنگامہ برپا کیا جا رہا ہے؟ ہاں اگر ہم نے فکر و عمل کی ساری قوتوں کے ساتھ طریقۂ انبیاء کے مطابق یہ کوشش کر لی ہوتی، اور اس کے بعد بھی ساحلِ مراد دکھائی نہ دیا ہوتا تو یہ ایک تجربہ ہوتا جو عدمِ امکان کے دعوے کے حق میں بطور دلیل پیش کیا جا سکتا تھا، مگر یہ عجیب ڈھٹائی ہے کہ آپ دریا میں اترتے نہیں اور دور سے کھڑے کھڑے اس کی اتھاہ گہرائی ناپ لینے کا دعویٰ کر رہے ہیں۔ آپ یقین فرمائیے جو ذہنیت آج کے حالات کو نامساعد اور کامیابی کو ناممکن قرار دے رہی ہے وہ قیامت تک امکانات کے حصول میں ناکام رہے گی۔ اور اس ذہنیت کے تحت کبھی بھی یہ جدوجہد شروع نہیں کی جا سکتی۔ جس کفر سے آج وہ لرزاں ہے وہی کل بھی رہیگا خواہ اس کی شکلیں بدلتی رہیں، مگر پیامِ حق کے لئے ہر کفر کفر ہے وہ اپنے کسی دور اور کسی شکل میں بھی حق کو زندگی کا حق دار سمجھنے کا روادار نہیں ہو سکتا۔ اور نہ ٹھنڈے دل سے اپنے سامنے اس کو پاؤں جمانے کا موقع دے سکتا ہے۔ جب بھی اقامتِ حق کے لئے جدوجہد کی جائے گی، کفر اپنے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر سامنے آئیگا اور مختلف اشکال میں وہی تمام زحمتیں، رکاوٹیں، مشکلیں اور مصیبتیں استقبال کیلئے موجود ملیں گی جن کا آج تصور کیا جا سکتا ہے۔ سمجھنا نہ چاہیئے کہ یہ راہ ہمیشہ خارزاروں اور شعلہ زاروں ہی سے ہو کر گذری ہے۔ اب یا آئندہ جب بھی گذرے گی انہی کانٹوں اور انگاروں میں سے ہو کر گذرے گی۔ وہ امکان اور سازگاری جس کی آپ کو تلاش ہے اس راہ کے مسافروں کو نہ کبھی ملی ہے نہ مل سکتی ہے

قرآن نے اس حقیقت کو اتنی وضاحت کے ساتھ بیان کر دیا ہے کہ شک و ریب کا کوئی گوشہ باقی نہیں چھوڑا ہے۔ اس نے بتا دیا ہے کہ ایمان کا ہر دعویٰ جانی و مالی آزمائشوں کی بھٹی میں ڈال کر تپایا جاتا ہے اور کوئی دعویٰ عنداللہ اس وقت تک قبول نہیں کیا جاتا جب تک وہ اس بھٹی میں تپنے کے بعد اپنے کو کھرا نہ ثابت کر دے حتیٰ کہ اگر بظاہر ایمان کی راہ صاف اور بے خطر نظر آ رہی ہو تو بھی قدرت اس ابتلا کے لئے ایسے حالات پیدا کر کے رہتی ہے جن میں اس دعوے کی صداقت کا امتحان ہو جائے

اب یہ منطق ہماری سمجھ سے باہر ہے کہ جن ابتلاؤں اور ناسازگاریوں کو سنت اللہ ادعائے ایمان کے امتحان کے لئے ضروری قرار دیتی ہے آپ اس کا استقبال کر کے اپنے دعوے کا ثبوت دینے کے بجائے الٹا دور بھاگ رہے ہیں، اور انہی کو الٹا اپنے ادائے فرض کو ترک کرنے کے جواز میں پیش کر رہے ہیں۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ انگریزی فوج کا کوئی سپاہی میدان جنگ کا رخ کرنے سے اس لیے انکار کر دے کہ وہاں سے بندوقوں اور توپوں کے چھوٹنے کی دہشت ناک آوازیں آ رہی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وکٹوریہ کراس کا اولین مستحق اپنے ہی کو یقین کرتا ہو۔ حالانکہ یہ معرکہ ہی وہ آزمائش گاہ ہے جو اس تمغۂ شجاعت کا استحقاق عطا کرتی ہے۔

مفادِ ملی کا بُت | اس سلسلہ میں ہمارے لئے سب سے زیادہ حیران کن جو

شے ہے وہ "مفادِ ملت" کے نقصانات کا ذکر ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جس مسلمان کو

كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ ۔ (نساء - ۲۰)

قسط پر بہر حال مضبوطی سے قائم رہنے والے اور اللہ کے لیے (حق کی) شہادت دینے والے بنو، اگرچہ اس (قسط پر قائم رہنے اور اس شہادتِ حق) کی زد خود تمہارے ہی اوپر یا تمہارے والدین یا اقرباء ہی پر کیوں نہ پڑتی ہو۔

کی تعلیم دی گئی تھی اور جس کے متعلق یہ طے کر دیا گیا ہے کہ

إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ (توبہ - ۱۴)

اللہ تعالےٰ نے مومنوں کی جانیں اور ان کے مال جنت کے عوض خرید لئے ہیں۔

اب اُس کو اس امر کی تلقین کی جا رہی ہے کہ تو حق اور عدل و قسط کی راہ چھوڑ دے، اگر اس کے اختیار کرنے میں تیری قوم کا نقصان ہوتا ہو، اور خدا کی رضا جوئی کو دُور پھینک دے اگر اس سے تیری جان و مال پر آنچ آتی ہو! آخر مفادِ ملت کے نام پر اقامتِ دین کے فرض سے ہاتھ اٹھانے کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ اب مسلمان کی نگاہ میں مرکزی اہمیت دین اور قیامِ دین کو نہیں بلکہ اس کے اپنے معاشی و سیاسی مفاد کو حاصل ہو گئی ہے، اب وہ کوئی ایسا طریقِ کار نہیں اختیار کر سکتا جس میں کلمۂ حق کی سربلندی اور مطالباتِ دین کی

بجا آوری کو جو ٹکراتے یا اپنی "قوم" کے مفاد خطرے میں پڑتے ہوں، اس کو چاہئیے کہ دین کو دنیا پر، آجلہ کو عاجلہ پر، معاد کو معاش پر، رضائے الٰہی کو مفادِ قومی پر، شہادتِ حق کو مقاصدِ سیاسی پر، اقامتِ دین کو مصالحِ ملی پر یعنی مقصدِ زندگی کو زندگی پہ قربان کر دے۔ العیاذ باللہ، یہ "ذہنیت" ہے آج ہم مسلمانوں کی، اور یہ اندازِ فکر ہے پیروانِ قرآن کا، جس پر کفر اور مادیت بھی عش عش کر اٹھے۔ ہم اس نظریہ کے واضعین اور حاملین سے اس کے سوا کچھ نہیں کہنا چاہتے کہ:

"کوئی آدمی دو مالکوں کی خدمت نہیں کر سکتا ...... تم خدا اور دولت دونوں کی خدمت نہیں کر سکتے۔" (حضرت مسیحؑ)

اس نظریہ کے ساتھ خدا پرستی کا جوڑ کبھی نہیں لگ سکتا، جس مفادِ قومی کا آپ شور مچا رہے ہیں وہ ایک خطرناک بت ہے جس کو توڑے بغیر اسلام کا مفاد پورا نہیں کیا جا سکتا۔

زمانۂ نبوت میں منافقین کا نقطۂ نظر یہ تھا اور ان کے نفاق کی بنیاد اس چیز پر تھی کہ نَخْشٰى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ ہم کو ڈر ہے کہ اگر ہم کھلم کھلا اور یکسو ہو کر اسلامی جماعت میں شامل ہو گئے تو ہم کو مصیبتیں گھیر لیں گی، اور اسلام کی وجہ سے ہم سارے جہان کی عداوتوں کا نشانہ بن جائیں گے۔ اسی طرح بہت سے کافروں کا بھی کہنا یہ تھا کہ محمد! تمہاری باتوں کی صداقت و صحت کا ہم انکار نہیں کرتے، مگر:

اِنْ نَّتَّبِعِ الْهُدٰى مَعَكَ نُتَخَطَّفْ اگر ہم آپ کے ساتھ ہو کر ہدایتِ الٰہی کی پیروی

میں آ دھینا۔ کریں تو فوراً اپنی مادرِ وطن سے مار کر نکال باہر کر دیئے جائیں گے۔ (قصص ۶۰)

یہ دونوں گروہ اتباعِ حق کے بارے میں جس طرزِ فکر و استدلال سے کام لے رہے تھے کیا وہی طرزِ فکر و استدلال آج بھی مفادِ قومی کے نعروں کے پیچھے کام نہیں کر رہا ہے؟ قرآن سراپا حق ہے، پیغمبر صادق و مصدق ہے، اتباعِ اسلام ہی ذریعۂ نجاح و فلاح ہے، لیکن اگر قرآن کے مطالبے، رسول کے فرمان اور اسلام کے اصول و مقتضیات پر عمل ہوا تو ہم برباد ہو جائیں گے۔ ہم کو اندیشہ نہیں بلکہ یقین ہے کہ زمانہ بھر کی آفات و بلیات ہم پر ٹوٹ پڑیں گی، ذرہ ذرہ ہماری مخالفت پر کمر باندھ لے گا، اپنی "مادرِ وطن" کو انگریز ہی کے قبضہ میں رہنے دیں گے، یا برادرانِ وطن کے اقتدار میں دے دیں گے، اور ہم خود غلام اور اچھوت، مفلس و پسماندہ اور خدا جانے کیا کیا ہو جائیں گے! کاش مسلمان اپنے خلاف اللہ تعالیٰ کو ایسی کھلی ہوئی حجتیں دینے سے قبل ذرا سوچ لیتے کہ ہم اپنی زبانوں سے کیا کہہ رہے ہیں۔ یہ تو مفادِ قومی کو بچانا نہیں ہے بلکہ اللہ کے غضب کو دعوت دینا ہے۔

پھیر کے راستے | اب رہا یہ سوال کہ آیا ہم اس نصب العین کے لئے براہِ راست جد و جہد کرنے کے بجائے کوئی پھیر کی راہ اختیار کر سکتے ہیں یا؟ سو اس کے متعلق تجربہ اور عقل دونوں کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ یہ طرزِ عمل سراسر غلط اور ناکام ہے، اور حق کی فطرت بھی اس سے ابا کرتی ہے، اب تک کی تاریخ بھی

بتلاتی ہے کہ جن لوگوں نے بھی اس مقصد کو اپنا مقصدِ زندگی قرار دیا ہے
اُن میں سے کسی نے بھی یہ پالیسی اختیار نہیں کی۔ متمدن یا غیر متمدن، آزاد
یا غلام، دولتمند یا مفلس، غرض جس قسم کی قوم کے اندر بھی کوئی داعیِ حق
اور علمبردارِ پیامِ دین آیا، اس نے سب سے پہلی آواز جو منہ سے نکالی وہ
یہی اور صرف یہی تھی کہ "اے بندگانِ خدا! خدا کی بندگی اور طاغوت سے
اجتناب اختیار کرو" ہم تفحص کے باوجود کسی نبی کو اس پالیسی سے ہٹ
کر کوئی دوسری پھیر والی پالیسی اختیار کرتے ہوئے نہیں پا سکتے۔ انھوں نے
ایسا کیوں کیا؟ ابھی اس سوال کو چھوڑ دیجئے، پہلے اس حقیقت کو پوری
جستجو اور تنقید کے ساتھ پرکھ لیجئے کہ ایسا ہی ہوا یا نہیں؟ اگر ایسا
ہوا اور یقیناً ہوا، تو پھر ان لوگوں کے لئے جو اسوۂ انبیاء ہی کو اپنا مرجعِ
کل ماننے کے مدعی ہیں، اس طریقِ کار کو ترک کرنا جائز کس [illegible] شرعی
کی بنا پر ہو سکتا ہے؟ اگر حالاتِ زمانہ کے اختلافات کوئی چیز ہیں تو کیا
اس بات کا دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ تمام انبیاء کے زمانہا نے ہوتے
تو بالکل یکساں نوعیت کے تھے جس کی وجہ سے ان سب کے زمانوں
میں اتنی کامل یکسانی اور مماثلت پائی جاتی ہے اور یہی زمانہ ہمارا صدی کا
ایک ایسا انوکھا اور غیر معمولی زمانہ ہے جس کے حالات کا [illegible]
آپ کی پوری تاریخِ انسانی کے حالات سے بالکل مختلف ہو گئے ہیں؟
ظاہر ہے کہ اس طرح کا دعویٰ کوئی بھی عاقل نہیں کر سکتا۔ اور سب
جانتے ہیں کہ کچھ غیر متغیر حقائق تو ایسے ہیں جو تمام زمانوں میں مشترک

رہے ہیں اور آئندہ بھی رہیں گے، مگر عوارض وظواہر اور احوال و ظروف ہر دور کے الگ الگ ہوتے رہے ہیں اور آئندہ بھی ہوتے رہیں گے، اس لئے اگر ان ظاہری خصوصیات کا لحاظ کیا جائے تو جس طرح آج کا زمانہ پہلی صدی ہجری سے مختلف ہے اسی طرح پہلی صدی ہجری کا زمانہ دورِ عیسوی سے اور دورِ عیسوی دورِ موسوی سے بھی مختلف تھا۔ اس لیے اگر اختلافِ احوال کے باوجود تمام انبیاء نے متفقہ طور پر ہمیشہ براہ راست جد وجہد کی پالیسی اختیار کی تو اس اختلاف کے باوجود بھی جو ہمارے زمانہ اور پچھلے زمانوں میں بظاہر نظر آتا ہے۔ ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ یہی پالیسی اختیار کریں۔ کیونکہ اس کام کے لئے کوئی دوسرا طریقہ کبھی آزمایا ہی نہیں گیا۔ اور تمام انبیاء کا اسی طریق کار کو اختیار کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اس جد وجہد کا مزاج ہی اسی قسم کا ہے کہ اس کے لیے براہ راست اقدام کیا جائے۔ یہ دلیل یقین سے بڑھکر ہم کو حق الیقین اور عین الیقین کی حد تک پہونچا دے سکتی ہے۔ اگر ہم اس چیز کو سامنے رکھ لیں کہ بعض انبیاء کو پھیر کی پالیسی اختیار کرنے کے بہتر سے بہتر مواقع ہاتھ آئے مگر انھوں نے پوری صفائی کے ساتھ ان کو ٹھکرا دیا۔ سید الانبیاء صلعم کے سامنے قریش نے یہ پیش کش کی کہ آپ کو ہم اپنا بادشاہ بنائے لیتے ہیں اور اس کے لئے ہم آپ سے یہ مطالبہ بھی نہیں کرتے کہ آپ اپنی "دعوتِ توحید" سے دستکش ہوجائیں، آپ سے ہماری صرف اتنی گزارش ہے کہ آپ ہمارے بتوں

کو بُرا کہنے اور ہمارے جذبات کو ٹھیس لگانے سے باز رہیں۔ غور فرمائیے
کہ آج کے اہلِ سیاست و تدبّر کے نقطۂ نظر سے یہ کتنا اچھا اور مغتنم
موقع تھا کہ رسول اللہ اس پیش کش کو قبول فرما کر ایک طرف تو ان
مصیبتوں اور فتنوں کا خاتمہ کر لیتے جو ان کی اور ان کے پیرووں کی
زندگی اجیرن کیے ہوئے تھے، دوسری طرف تختِ حجاز پر قابض ہو کر
حکمت و تدبر اور مصلحت شناسی کے ساتھ اپنے حاکمانہ اثر و اقتدار سے
کام لیتے ہوئے تدریجاً اپنی منزلِ مقصود کی طرف مارچ کرتے، اور رفتہ
رفتہ دینِ حق کو مملکتِ حجاز و عرب پر قائم کر دیتے۔ مگر آپ کو معلوم ہے
کہ پیغمبرِ عالم نے اس مغتنم "موقع پر کیا طرزِ عمل اختیار کیا، اور اس پیش کش
کا کیا جواب دیا؟ یہ کہ "خدا کی قسم اگر میرے داہنے ہاتھ میں سورج اور
بائیں ہاتھ میں چاند رکھ دیئے جائیں تو بھی میں اپنی دعوتِ حق اور اپنے
طریقِ کار سے باز نہ آؤں گا۔" یہ کسی پر جوش اور ماؤف الدماغ انقلابی
نوجوان کے الفاظ نہ تھے بلکہ اس معلمِ حکمت اور راز دانِ حقیقت کے الفاظ
تھے جس کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ اس کے دل اور زبان پر براہِ راست
خدا کی نگرانی قائم تھی، اور جس نے کبھی کوئی بات جذبات کے ہیجان میں نہیں
کہی۔ اس لیے ایک مومن کا ذہن تو اس وہم کو اپنے قریب بھی نہ پھٹکنے
دے گا کہ آنحضرت نے اس موقع اور اس طریقِ کار کے ہاتھ آتے
ہوئے بھی عمداً ان کو ترک کر دیا جو حصولِ مقصد کے لیے براہِ راست
جد و جہد سے زیادہ موزوں اور کارگر تھے، یا یہ کہ ان میں، نعوذ باللہ

دورِ حاضر کے مدبروں کے اتنی بھی انجام بینی نہ تھی، اور نہ یہ صلاحیت تھی کہ "احوال و ظروفِ زمانہ" کے مطالبات و مقتضیات کا اندازہ کر سکتے اور وقت و ماحول کی مصلحت سے اس پالیسی کو قبول کر لیتے۔

اب ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ انبیائے کرام کے اس اسوے اور مسنون طریقِ کار کے ہوتے ہوئے ہم کو کس اسوہ اور لائحہ عمل کی ضرورت ہے۔ نظری حیثیت سے بھی دیکھئے تو اس طرزِ فکر اور اس نظریے میں بجز بے بنیاد وہموں اور طفلانہ خوش گمانیوں اور خود فریبیوں کے سوا کچھ نظر نہ آئیگا۔ پیش کردہ راستے اختیار کرنے کے معنی یہ ہیں کہ حق کو باطل نما بنا کر پیش کیا جائے، دوسرے جس باطل میں آپ پھنسے ہوئے ہیں اس سے نکل کر حق کی طرف جانے کے بجائے ایک دوسرے باطل کے سایے میں جا کھڑے ہوں، کیونکہ اگر آپ موجودہ باطل ماحول کو درہم کر کے ایک ایسا ماحول قائم کریں جو حق نہ ہو تو لازماً باطل ہی ہوگا جس کا رنگ و روغن تو نیا ہوگا مگر فطرت بہرحال وہی ہوگی جو موجودہ باطل کی ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ ہم اس پر اقتدار حاصل کر کے نصب العین کے لئے زیادہ سازگار بنا لیں گے۔ مگر افسوس ہے کہ دنیا کے عمل میں اس خام خیالی کی کوئی قیمت نہیں۔ باطل کبھی حق کا سازگار نہیں ہو سکتا، اور اس میں حق کے جو پیوند آپ ہزار وقت لگائیں گے وہ آپ کے مقصد کے لئے خالص باطل اجزاء سے زیادہ بڑے مضر ثابت ہوں گے۔ دور نہ جائیے اسی ہندوستان میں بہت سے "اسلامی ریاستیں" قائم ہیں جن میں وہ تمام باتیں موجود ہیں جن کا آپ

آئندہ نظامِ ملکی میں جوڑ لگانا چاہتے ہیں، مگر وہاں اقامتِ دین کا نام ہی لیکر دیکھیے، جیل کا دروازہ اپنے سامنے کھلا ہوا پائیں گے۔ آپ اپنی اس جد و جہد میں غیر ملکی حکومت ہی کو سدِ راہ سمجھتے ہیں اور اسی لیے اس کے ہٹ جانے کا انتظار کر رہے ہیں، مگر آپ شاید بھول رہے ہیں کہ حضرت مسیح کے مشن کے متعلق رومی اقتدار ابھی خاموش ہی تھا کہ ان کی اپنی ہی قوم یا یوں کہیے کہ اس وقت کے "مسلمانوں" ہی نے بڑھ کر اس مشن کا گلا گھونٹ دیا، پھر اپنی حال ہی کی تاریخ پر نظر ڈالیے۔ شیخ عبد الوہاب نجدی کی تحریک کا "متعلقہ" "اسلامی" حکومتوں نے کس تپاک سے استقبال کیا۔ شیخ جمال الدین افغانی نے ایک جزئی دینی تحریک کا نام لیا، اور آپ کی انہی موجودہ اسلامی حکومتوں نے ان کو رہنے کے لیے جگہ دینے سے انکار کر دیا۔ اور اگر آج بھی کسی کو ہمت ہو تو ان ممالک میں جا کے یہ آواز اٹھا کر قدرِ عافیت معلوم کر سکتا ہے۔

درحقیقت یہ دفع الوقتی کی باتیں ہیں اور یہ نظریہ اسی ذہنیت کی پیداوار ہے جس نے قرآن کے احکام و مطالبات کی ناسازگاری سے گھبرا کر مطالبہ کیا تھا کہ "اس کے بجائے کوئی دوسرا قرآن لائیے یا اسی میں کچھ ایسی ترمیمیں کر دیجیے جو زمانہ اور ماحول سے ہم آہنگی پیدا کر سکیں" اس طرز پر سوچنے والوں کی نگاہ شاید اس طرف نہیں جاتی کہ دنیا کے جو ہنگامے آج ہیں، کل بھی رہیں گے، اور جو مصالح اور مشکلات آج ان کا راستہ روک رہی ہیں، آئندہ بھی ان میں کوئی کمی ہونا تو [illegible]

جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ پھیر کی راہ اختیار کرنے کے اسباب و محرکات نہ کبھی ختم ہوں، اور نہ اقامتِ دین کے لئے کبھی براہِ راست جدوجہد کی جائے۔

گرفتارانِ یاسِ دائمی | تیسرا گروہ جو کچھ کہتا ہے اور اُس کے نظریات اور دلائل کی جو فہرست ہے، اس کا بڑا حصہ تو وہی ہے جو دوسرے گروہ کی زبانی گذشتہ بحث میں آپ سُن چکے ہیں۔ اس لیے ان کو دوبارہ نقل کرنے اور ان کی غلطی واضح کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن بعض حیثیتوں سے یہ لوگ ان کی بہ نسبت ایک قدم آگے ہیں، اور ترکِ فرض اور فراموشیِ عہد کی جو بیماری وہاں سیاسی تدبر اور زمان و مکان کی مصلحتوں کے پردوں میں چھپا دی گئی تھی یہاں صاف گوئی اور "جرأت" کے ساتھ علانیہ ظاہر کر دی گئی ہے، اس لیے ان لوگوں کے ظاہر و باطن کی یکرنگی کا ہم اعتراف کرتے ہیں۔ گو اس قلتِ حیائے ایمانی کا احساس دل پر چوٹ لگاتا ہے جو اس اظہارِ "جرأت" کے نیچے کام کر رہی ہے اور کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا ان لوگوں نے اپنے جسم سے کپڑے اُتار کر پھینک دیئے ہیں۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ان میں سے کتنوں نے یہ حیا کُشی ہوش و بیداری کے عالم میں کی ہے، اور کتنوں نے غفلت و بے ہوشی کی حالت میں؟ ایک طرف اقامتِ دین کی اس اہمیّت کو سامنے رکھیئے کہ اسلام اور قیامِ دین کی سعی و جہد میں باہم وہی تعلق ہے جو ایک زندہ انسان کی زندگی اور اس کی حرکتِ قلب میں ہے، جیسا کہ ہم اوپر دلائل کی روشنی میں واضح کر چکے ہیں

پھر اس کے بعد ان لوگوں کی ان ــــ بظاہر عاجزانہ مگر فی الواقع باغیانہ
ــــ باتوں کا گہری نظر سے تجزیہ کیجئے کہ "یہ نصب العین ہے تو بالکل
برحق، مگر ہم جیسے کمزور لوگوں کے بس کا یہ کام نہیں ہے جس مشن
کو پیغمبر کی تربیت یافتہ جماعت بھی تیس برس سے زیادہ نہ چلا سکی اس
کے لئے ہم جیسے ضعیف الایمان لوگوں کا دم خم دکھانا تقدیر سے لڑنا ہے
اب وہ زمانہ واپس نہیں آسکتا جو تیرہ سو برس پہلے گذر چکا ہے۔" توقع
ہے کہ اس تجزیہ سے آپ بھی وہی حقیقت منکشف ہوگی جو ہم کہنی چاہتے
ہیں۔ جب اقامتِ دین کی جدوجہد سے برضا و رغبت کنارہ کش ہو کر اور
باطل کے مقابلہ اور منکرات کے ماحول میں عدم مداخلت اور صلح کل کی
پالیسی اختیار کر کے انسان پیروانِ اسلام کی صفِ پائین میں بھی جگہ
نہیں پا سکتا اور اللہ کے رسول نے ایسے انسان کو ایمان کے آخری
درجے سے بھی محروم قرار دیا ہے تو بڑی سے بڑی کمزوری اور مایوسی
بھی اس فرض کی انجام دہی سے ایک لمحہ کے لئے بے تعلق نہیں کر سکتی
اور اگر کہیں یہ بے تعلقی ہے تو وہاں کسی کمزور سے کمزور ایمان کی تلاش
بھی بے سود ہے۔ اسلام نے اپنا کوئی ایسا "سستا ایڈیشن" شائع
نہیں کیا ہے جس کے تحت اس "دم خم دکھانے" اور "تقدیر سے لڑنے"
سے نجات ممکن ہو۔ وہ شخص دھوکے میں ہے جو یہ سمجھے بیٹھا ہے کہ اس
لازمۂ ایمانی سے بے بہرہ رہ کر بھی ایمان و رضائے الٰہی کی کوئی مقدار
حاصل کی جا سکتی ہے۔

تاریخ خلافت کی غیر متعلق بحث

ان لوگوں کے فکر و عمل کی بنیادوں میں سب سے زیادہ اہمیت اور مرکزیت جس چیز کو حاصل ہے اور جس کا گذشتہ مباحث میں ابھی تک تنقیدی جائزہ نہیں لیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ "جو چیز صحابہ کے ہاتھوں بھی تیس برس سے زیادہ نہ قائم رہ سکی، اس کے لئے کوئی سعی بالکل لا حاصل ہے۔" یہ ایک الم ناک حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے دلوں میں مایوسی اور دل شکستگی کا زہر پیدا کرنے میں اس فقرہ نے جتنا مؤثر پارٹ ادا کیا ہے، اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس حقیقت کی المناکی کا صحیح ادراک اسی وقت ہو سکتا ہے جب یہ معلوم ہو جائے کہ جس چیز کو بنیاد قرار دے کر اقامت دین کے فرض کو ساقط سمجھ لیا گیا ہے، اس کا اس فرض کی ادائگی سے کوئی تعلق ہی نہیں۔ ذرا سوچئے تو سہی کہ کسی نظریہ، کسی اصول اور کسی نصب العین پر ایمان لانے کا دعویٰ کرنا اور ساتھ ہی اس کے اتباع اور اس کے مقتضیات ادا کرنے سے اس بنا پر انکار کر دینا کہ اس نصب العین کو کبھی زمانۂ دراز تک برقرار نہیں رکھا جا سکا، اپنے اندر معقولیت کا کوئی شمہ رکھتا ہے؟ اس سے بڑھ کر قول و عمل کے تضاد کی مثال اور کیا ہو سکتی ہے؟

لہ (حاشیہ صفحہ ۱۱۹) اس موقع پر "امکان و عدم امکان" "کامیابی کا اسلامی تصور" اور "اقامت دین کے سلسلہ میں بندوں کی ذمہ داری" وغیرہ بحثوں کو جو گذشتہ صفحات میں گذر چکی ہیں، ذہن میں رکھنا چاہئے۔ ورنہ یہاں اس اجمالی بیان سے غلط فہمی پیدا ہونے کا احتمال ہے۔ (ص)

سوال یہ ہے کہ آپ نے اس شئے کو اس لیے اپنا مقصدِ زندگی ٹھہرایا ہے کہ وہ فی نفسہ حق ہے اور اس کی حقانیت کا علم و یقین اس کو اپنانے پر مجبور کر رہا ہے یا اس کا کوئی دوسرا سبب ہے؟ اگر کوئی دوسرا سبب ہے تو پھر آپ سے نہ کوئی مطالبہ ہے نہ آپ پر کسی جد و جہد کے ترک کرنے کا الزام، لیکن اگر پہلی بات ہے، جیسا کہ توقع کی جانی چاہیئے، تو ایک کافر بھی آپ کو یہ طرزِ استدلال اختیار کرنے میں حق بجانب نہیں قرار دے سکتا، تیس اور چالیس برس تو نہیں، اگر ایک دن بھی یہ مشن کامیابی کے ساتھ نہ چل سکا تو اس سے آپ کی ذمہ داریوں میں ذرہ بھر بھی تخفیف نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے سر دھڑ کی بازی لگا دیجئے، اس لئے کہ آپ نے اس کو حق کہا ہے اور اس کی علمبرداری کا دعویٰ کیا ہے، یہ دیکھنے کی گنجائش کہاں ہے کہ اس راہ میں کس نے کیا کیا اور کب کیا کیا کیا؟ آپ کے فرائض کی تعیین وہ نصب العین کرے گا جس کو حق سمجھ کر آپ نے قبول کیا ہے، تاریخ نہیں کرے گی۔

لیکن اگر آپ کو اپنی "اس" دلیل" پر گہرا اعتماد اور اصرار ہے اور اس میں اتنا وزن محسوس کرتے ہیں کہ وہ اقامت دین کی جد و جہد سے سبکدوش کر دینے کے لئے کافی ہے، تو ہم گذارش کریں گے کہ ذرا اس کو اور وسعت دے دیجئے اور اسی اصول پر یوں سوچنا شروع کیجئے کہ مسلمان کی جو صفات و خصوصیات کتاب و سنت میں بیان کی گئی ہیں اور ایمان و اسلام کا جو معیار اللہ اور اس کے رسول نے پیش کیا ہے، اس معیار پر پورے اترنے والے اور ان صفات و خصوصیات کے حامل انسان ابوبکر صدیق، عمر فاروق، عثمان غنی

علی مرتضیٰ، ابوذر غفاری، سلمان فارسی، صہیب رومی، بلال حبشی رضوان اللہ علیہم اجمعین، اور انھیں کی طرح کے چند سو یا چند ہزار نفوس سے زیادہ نہیں پیدا ہو سکے۔ اور اس وقت تو اس معیار کے مسلمانوں کا عالم تصور میں بھی وجود ممکن نہیں، اس لیے اب ایسے معیارِ دینی کا ذکر اور خیال ہی چھوڑ دینا چاہیے اور اسلام کی ان مطلوبہ صفات و خصوصیات کے لئے سعی و جہد کرنا بالکل لا حاصل ہے، یہ ہم جیسے کمزور انسانوں کے بس کا کام نہیں ہے" اگر اجتماعی میدان میں خلافت راشدہ کی قلتِ عمر اس امر کا حق دے سکتی ہے، کہ اب قیامت تک کے لیے قیام دین کے تصور سے ذہنوں کو خالی کر لیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ انفرادی زندگی میں بھی اس استحقاق معذرت کو قبول نہ کیا جائے۔ لیکن یہ عجیب ماجرا ہے کہ باوجود اس کے کہ اب ایک ابو بکر بھی پیدا نہیں ہو رہا ہے آپ نہ صرف خود کمال ایمانی کے حصول سے مایوس ہو کر اسلام سے علیحدگی پر تیار نہیں بلکہ گمراہوں کو راہ یاب، جاہلوں کو دین آگاہ اور غیر مسلموں کو مسلمان بنانے کے لئے زندگیاں وقف کئے ہوئے ہیں تبلیغی انجمنیں قائم کرتے ہیں، اشاعتِ دین کے ادارے کھول لیتے ہیں، تعلیم کتاب و سنت کے لئے درسگاہیں جاری کرتے ہیں، آخر ایسا کیوں ہے؟ کیوں نہیں ایسا ہوتا کہ صدیق رضی و فاروق رضی کی سی اسلامیت کے حصول سے کہ قرآن کا معیارِ مطلوب یہی ہے، مایوس ہونے کے باعث اسلام کا نام لینا چھوڑ دیا جاتا؟ آپ کہیں گے کہ ابو بکر صدیق اور عمر فاروق اسلام کے کامل العیار اور اعلیٰ نمونے تھے، ان کے مقابل کا ایمان و تقویٰ اگر ہم غلط پیدا کر سکتے تو اسکا مطلب نہیں ہے کہ سرے سے اسلام ہی کو چھوڑ دیں بلکہ ان نمونوں کو سامنے رکھکر

اپنی استطاعت کے مطابق کوشش کریں گے کہ جہاں تک ہوسکے انہی کی طرح کا تدین اپنے اندر پیدا کریں۔ تاریخ نے ہمارے سامنے اسلام کے یہ اعلیٰ ترین نمونے رکھ دیے ہیں تاکہ اپنے امکان بھر ہم اپنے کو ان پر ڈھالنے کی سعی کریں۔ اب جس کو اللہ تعالیٰ جتنی توفیق دے، اس حد تک اس رنگ میں اپنے آپ کو رنگنے کی کوشش کرے اور ان کے مقامِ ایمانی کی طرف جتنے قدم بڑھا سکتا ہے بڑھاتا رہے۔ ہم اس طرزِ فکر سے سو فیصدی اتفاق کرتے ہیں، ہماری گذارش بالکل اسی مرکزِ فکر پر مبنی ہے، فرق صرف یہ ہے کہ آپ اس کو انفرادیت کے ایک محدود دائرے میں رکھنا چاہتے ہیں، اور ہم اسی کو اجتماعیت تک پھیلا دینا چاہتے ہیں۔ ہمارا مدعا یہ ہے کہ اسی نقطۂ نگاہ سے آپ کو خلافتِ راشدہ کے اوراقِ تاریخ کو بھی دیکھنا چاہیے۔ ابوبکر اور عمر اور عثمان و علی رضوان اللہ علیہم کی انفرادی زندگیوں کی طرح ان کا طرزِ خلافت اور ان کی نیابتِ رسول بھی ایک اعلیٰ معیار تھی، جسے اللہ تعالیٰ کی حکمت و مشیت نے تاریخ کے سینہ میں محفوظ کر دیا ہے تاکہ دعوتِ قرآنی کے علمبردار اپنی جد و جہد کے سلسلہ میں اپنے سامنے ایک عملی اور معیاری نمونہ رکھ سکیں۔ اور جس حد تک ان کے وست و بازو میں خدا نے توانائی بخشی ہو اس نمونہ کے اتباع میں صرف کریں، اور اس وقت تک اطمینان کا سانس نہ لیں جب تک کہ اللہ کا دین اپنی رحمتوں کے ساتھ اس زمین پر اسی طرح نہ چھا جائے جس طرح خیر القرون میں چھا گیا تھا۔ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَۃٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ لِلّٰہِ۔ پس اس تیس سالہ دورِ خلافت کو اپنے لیے مثال

اور ایک اسوہ بنائیے اور اس کے جمالِ جہاں آرا کے عشق سے ہر دم اپنے سینوں کو گرم رکھیے۔ حیف ہے اگر اس کے نام سے دلوں میں مایوسی اور افسردگی کی لہریں اُٹھیں۔ اس نام میں تو بلا کی کشش اور اس کشش میں طوفان کا سا جوش بھرا ہوا ہے۔ اگر ہمارا یقین ہے کہ دنیا کو فلاح وسعادت صرف دینِ حق کے قائم ہونے پر ہی مل سکتی ہے، اور اگر ہمارے قلوب اس مبارک زمانہ کی سچی قدر اور محبت رکھتے ہیں جبکہ دنیا میں خلافتِ راشدہ قائم تھی تو اس یقین اور اس محبت کا فطری تقاضا یہ ہونا چاہیے کہ دل اس افسانۂ کہن کو از سرِ نو عالمِ واقعات میں دیکھنے کے لئے ٹھیک اسی طرح بے قرار ہے جیسے کہ کسی کی کوئی عزیز ترین شے کھو گئی ہو، اور وہ اس کی جستجو میں دیوانہ وار سرگرداں پھر رہا ہو۔ جس شخص کے ایمان میں یہ شورش نہ ہو وہ دراصل ایمان ہی نہیں بلکہ تصورات کا ایک بتکدہ ہے۔

نظامِ اسلامی پر ایک شدید بہتان

سطورِ بالا میں ہم نے اسلام کے انفرادی اور اجتماعی معیاروں پر جو اشارات کیے ہیں اُن سے یہ حقیقت بھی بے نقاب ہو جاتی ہے کہ روئے زمین پر صرف تیس سال نظامِ اسلامی کو برقرار سمجھنا تاریخِ اسلامی کے غلط مطالعہ کا نتیجہ ہے اور اس خیال کے پیدا کرنے میں چالاک دشمنوں کی عیاری اور نادان دوستوں کی سادہ لوحی دونوں ہی شامل ہیں۔ اگر حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے بعد بھی مسلمان پیدا ہوتے اور برابر پیدا ہوتے رہے تو ان کی خلافتوں کے بعد بھی نظامِ اسلامی قائم رہا۔ فرق صرف یہ تھا کہ جس طرح ان کی شخصیتیں بے داغ تھیں اسی طرح ان کی خلافتیں بھی

غیر کامل کا نمونہ تھیں، اور اس دور سعید کے ختم ہونے کے بعد جس طرح شخصیتیں
ناقص تھیں، مگر پھر بھی مسلمان تھیں، اسی طرح اس وقت کے نظام ہائے اجتماعی
بھی ناقص تھے مگر پھر بھی بالکل غیر اسلامی نہ تھے۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھیے
کہ جس طرح افراد میں اسلامیت کے مدارج مختلف ہوسکتے ہیں اسی طرح نظام ہائے
سیاست کے بھی دینی نقطۂ نظر سے مختلف مدارج ہوسکتے ہیں جس طرح اشخاص
میں کمزوریاں ہوتی ہیں اسی طرح اسٹیٹ میں بھی ہوتی ہیں۔ خود اسی زمانہ راشدہ
کے تمام ادوار اپنی روح میں یکساں نہ تھے بلکہ عثمانی اور علوی دورِ خلافت، صدیقی
اور فاروقی ادوار سے فروتر تھے جس پر احادیث اور تاریخ دونوں شاہد ہیں۔
اس لیے جیسے ہم افراد کی کمزوریوں پر تنقید تو کرتے ہیں مگر ان کو دائرۂ اسلام
سے خارج نہیں سمجھتے، اسی طرح دورِ خلافت کے بعد قائم رہنے والے سیاسی
ڈھانچوں پر سخت سے سخت تنقید تو کرسکتے ہیں اور اس کو جاہلیت کے عناصر
مخلوط بھی کہہ سکتے ہیں مگر انتہائی زیادتی ہوگی اگر اس کو بالکل غیر اسلامی
قرار دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جس طرح علمائے حق حسب الامکان
اور گنہگار انسانوں کی ہدایت و ارشاد کا فرض ادا کرتے تھے اسی طرح
حکمران وقت اور اس کے سیاسی نظم و نسق پر بھی اظہار نکیر کرتے رہتے
اور افراد کی طرح حکومتوں کی اصلاح احوال کی کوشش بھی ان کی زندگی
کا مستقل مشن تھا۔ لیکن انھوں نے کسی زمانہ میں کسی حکمران کے خلاف
یہ فتویٰ صادر نہیں کیا کہ اس کی حکومت سرے سے غیر اسلامی اور کافرانہ ہے
اور اس کے اندر رہ کر اپنی مقدرت کے مطابق اس کے سدھار کی

سعی کرتے رہے، جس کی وجہ یہی ہے کہ خلافتِ راشدہ کے خاتمہ کے بعد بھی
مدتوں جو نظامِ سیاست ممالکِ اسلامی میں جاری رہا وہ کسی نہ کسی حد تک
اسلامی تھا۔ عدالتیں اسلامی قوانین کے مطابق فیصلے کرتی تھیں، سزائیں
آئینِ شرع کے ماتحت دی جاتی تھیں، جائدادیں احکامِ دین کی رو سے تقسیم
کی جاتی تھیں۔ غرض زندگی کے عام معاملات میں اتھارٹی عملاً کتاب و سنت
ہی کو حاصل تھی، جو کچھ خرابی تھی حکمرانوں کی ذات میں تھی، مگر نظامِ دین کی
بالادستی اس طرح گوشہ گوشہ پر چھائی ہوئی تھی، اور اس کا پرجلال وقار
ذہنِ عام کو اس طرح اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھا کہ ان حکمرانوں کو بھی اپنی
کوئی غیر اسلامی کارروائی انجام دینے کے لیے چہرے پر تشرع کی نقاب ڈالنی
پڑتی تھی اور اس بات کا وہ تصور تک نہیں کر سکتے تھے کہ خدا کے دین اور
قانون کی جگہ اپنا دین اور قانون چلا دیں۔

استدراک | لیکن ہماری اس تقریر سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ ہم ان تمام
حکمرانوں کی حکومتوں کو خالص اسلامی نظام سمجھتے ہیں اور اقامتِ دین
کا فرض یاد دلانے کا مقصد یہ ہے کہ معتصم باللہ یا ہارون الرشید کی
طرح کی کوئی حکومت قائم کرنے کی دعوت دیتے اور اس پر مطمئن ہو جانے
کی تلقین کرتے ہیں، بلکہ دکھانا یہ مقصود ہے کہ خلافتِ راشدہ کے اختتام
سے بعد بھی ایک مدتِ دراز تک اللہ کا دین دنیا میں قائم و نافذ رہا۔ اگرچہ
اپنے مظاہر کے اعتبار سے بھی ناقص تھا، اور اپنی روح کے اعتبار سے بھی
اس لیے اس خیال کو اپنے ذہن میں جگہ دینا، کہ یہ نظام صرف چند دنوں

ہی قائم رہا۔ نہ صرف اسلام سے لوگوں کو دور کرنا ہے بلکہ تاریخی بددیانتی بھی ہے۔ اور ہمارا فرض ہے کہ اپنے علمی، دماغی، مالی اور جسمانی ذرائع سے کام لیتے ہوئے اپنے اس مقصدِ زندگی کی خاطر مسلسل جدوجہد کرتے رہیں نمونۂ کمال کے طور پر سامنے خلافتِ راشدہ کی مثال ہو۔ پھر اس مثال کی جہاں تک عملی پیروی ہماری حدِ استطاعت میں ہو اسے سرانجام دیدیں۔ بس اسی پر ہماری مسئولیت ختم ہو جاتی ہے، جس طرح صدیق و فاروقؓ بن جانا ہم پر فرض نہیں بلکہ ان کے نمونوں کو سامنے رکھکر حتی الامکان زیادہ سے زیادہ ان سے مماثلت پیدا کرنا ہمارا فرض ہے۔ اسی طرح، بہرحال، ان ہی کی طرح کی خلافت قائم کردینا ہماری ذمہ داری نہیں ہے بلکہ ہماری اصل ذمہ داری یہ ہے کہ ہم سے جہاں تک ہو سکے ان کی قائم کردہ خلافتوں سے بیش از بیش مشابہت رکھنے والا نظام اجتماعی قائم کرنے کی سعی کریں، اور آگے آنے والی نسلیں یکے بعد دیگرے اس مشابہت کے رنگ کو نمایاں سے نمایاں تر کرتی رہیں۔

متربصین کا گروہ

اب ان حضرات کے افکار و اعمال کا جائزہ لیجئے جو انتظار اور تربص کی پالیسی پر عمل پیرا ہیں، اور خود سلامتی و بے فکری کے محفوظ گوشوں میں بیٹھے ہوئے دوسروں کی ثبات قدمی اور تیز گامی کا حساب لگا رہے ہیں، اور اس نصب العین ہی کو اپنی زندگیوں کا تنہا مقصد سمجھنے کے باوجود

میدانِ سعی و عمل میں اس لئے نہیں اُترتے کہ پہلے سے اس میدان میں
اُترے ہوئے لوگوں کی عزیمت انھیں مشکوک نظر آتی ہے۔ جس کا مطلب
یہ ہے کہ اگر امام، صالح، اور متقی اور مقبول الصلوٰۃ نہ ہو تو یہ حضرات نہ صرف
یہ کہ اس کے پیچھے ہی نماز پڑھنے سے انکار کر دیں گے بلکہ سرے سے نماز
ہی ترک کر دیں گے۔ اور غالباً اس یقین کے ساتھ ترک کر دیں گے کہ کل
داورِ محشر کے سامنے یہ کہہ کر بری الذمہ ہو جائیں گے کہ خدایا! ہم تو نماز کو فرضِ
عین ہی سمجھتے تھے اور ہم گھنٹوں اس کے لئے باوضو رہتے تھے مگر مؤذن
کی صداؤں اور امامِ محلہ کی نمازوں میں ہم کو خلوص و للّٰہیت کی روح نظر
نہیں آتی تھی، اس لئے ہم نے نماز نہیں پڑھی۔ ہم باوجود غور و فکر کے اس
طرزِ فکر و استدلال کی کوئی شرعی یا عقلی بنیاد نہیں پا سکے۔ فرض کیجئے
کہ زید اقامتِ دین کی دعوت دے رہا ہے اور ان لوگوں کو جو اتباعِ
قرآن اور علمبرداریِ اسلام کے مدعی ہیں، ان کی فرض ناشناسیوں
پر ٹوک کر اور غفلت شعاریوں سے بیدار کر کے ان کا فرضِ زندگی
یاد دلا رہا ہے، اور اپنے طور پر اس راہ میں قدم بھی رکھ دیتا ہے لیکن
جہاں تک اس کی عملی صلاحیت، خلوص اور للّٰہیت کا تعلق ہے آپ
کے قلب کو پورا اطمینان نہیں ہوتا بلکہ وہ اور اس کے ساتھی ہم سفر نااہل،
بے عمل، غیر مخلص اور غیر متقی دکھائی دیتے ہیں، تو سوال یہ ہے کہ ان کی
یہ مذکورہ خامیاں آپ کے فرض کو ساقط اور آپ کو اس کی ذمہ داریوں
سے سبکدوش کس طرح کر دیں گی۔ کیا آپ نے اس امر کو اس لئے حق

مانا ہے کہ زید اور اُس کے ساتھیوں کی یہی رائے ہے؟ کیا آپ نے
دینِ حق کی اقامت کا فریضہ اس شرط کے ساتھ اپنا مقصدِ زندگی
تسلیم کیا ہے کہ پہلے زید اور اُس کے ہمراہی اداے فرض کا عملی ثبوت
دے لیں، تو ہم اپنے نرم گرم بستروں سے اُٹھیں اور اپنی خوابگاہوں سے
باہر قدم نکالیں ... کی مرکزی دعوت کے آپ اسی وقت
مکلف ہیں جب وہ ... تو اس کی راہ میں قربانیاں کرتے دیکھ لیں؟
اگر ایسا نہیں ہے اور قرآن گواہ ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ ہر فرد اپنی
استطاعت کے مطابق اس فریضہ کی بجا آوری کا بطورِ خود ہر حال میں
ذمہ دار اور مسئول ہے۔ تو اپنے نفس کی حیلہ سازیاں اور غفلتیں کیا کم
ہیں کہ دوسروں کی کمزوریاں ٹٹولنے کی آپ کو فرصت مل جاتی ہے۔ دوسرے
اگر فی الواقع ویسے ہی ہیں جیسا کہ آپ کا گمان ہے تو خدا کے رو برو اس
کے جوابدہ وہ خود ہوں گے، آپ اس کھود کرید کی زحمت بلا وجہ کیوں
اُٹھاتے ہیں، آپ اپنے نامۂ اعمال کی فکر کیجئے۔ ہاں اگر ان کے حالات
سے کچھ درس ملتا ہے تو اس کو لے لیجئے۔ لقمان حکیم سے پوچھا گیا:
"تم نے ادب کس سے سیکھا؟" جواب دیا: "بے ادبوں سے"۔ مومن کو بھی
اللہ تعالیٰ نے حکیم پیدا کیا ہے، اور ایسی ہی حق بیں، عبرت پذیر اور
حکمت پسند نگاہوں سے کام لینے کی تاکید کی ہے۔ سارا قرآن اس نے
مغضوب اور گمراہ قوموں کے تمثیلی تذکروں سے اسی لئے تو بھر دیا ہے
کہ مسلمان ان جیسی حرکتوں کے ارتکاب سے بچیں، اس لئے آپ کا اس

صورتِ حال میں جو فرض ہونا چاہیئے وہ صرف یہی ہے کہ ان کی خامیوں
ناہمواریوں اور غلط کاریوں سے اپنے دامن بچا کر خالص للہیت اور
عزیمت کے ساتھ اس جذبے کو لے کر آگے بڑھیں، اور اگر ہو سکے تو
ان کے لئے ہدایت، عزیمت، خلوص اور توفیقِ عمل کی دعا بھی کرتے
جائیں۔ کہ بہرحال ان کی چیخ پکار، اگرچہ وہ ان کی اپنی حد تک محض "زبانی
لقلقہ" تھی، مگر آپ کے حق میں ہادی اور مذکّر ثابت ہوئی، اس لئے وہ
آپ کے شکریہ کے مستحق ہیں نہ کہ مخالفت کے، کہ انہی کے "زبانی لقلقوں"
نے غفلت کے پردے چاک کر دیئے اور آپ کو بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا۔
اس نادان اور بدنصیب انسان پر، جو تاریکیوں کے ہجوم میں سر راہ چراغ
لے کر کھڑا ہو اور دوسروں کو تو ان کی منزلِ مقصود دکھا رہا ہو، مگر خود اپنی
آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہو؟ آپ کو ترس تو ضرور آنا چاہیئے، مگر اس پر
آوازے کسنے اور اعتراضات کرنے بجائے الفاظی، اور اس کی پیروی
میں چراغ کی روشنی سے فائدہ نہ اٹھانا اور پشت بمنزل ہو رہنا حماقت اور
دیوانگی ہے سعید وہ ہے جو دوسروں سے عبرت اور نصیحت حاصل کرے
اور دانائی کا تقاضا یہ ہے کہ قائل کی شخصیت کے بجائے اس کے قول کو
دیکھا جائے۔ پس اقامتِ حق کی پکار سن کر ان بندگانِ خدا کا طرزِ عمل
اختیار کیجئے جو سعید ہوں، جو دانا اور حقیقت بیں ہوں اور جن کی تعریف
قرآن کی زبان میں یہ ہے کہ:۔

الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ جو باتوں کو کان لگا کر سنتے ہیں اور ان میں سے

فَيَتَّبِعُونَ أَحْسَنَهُ — بہتر باتوں کو اپنے عمل و اتباع کے لئے انتخاب کر لیتے ہیں۔

اس لیے "احسن قول" — دعوت اقامت دین — پر اس پہلو سے بحث تو کی جا سکتی ہے کہ زیادہ "احسن القول" ہے یا نہیں؟ لیکن جب آپ اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ اس قول کے حسن ہونے میں کوئی شبہ نہیں، اور اس کا ہر مسلمان کا تنہا فریضۂ زندگی ہونا شک و ریب سے بالا تر ہے، تو پھر اس پر لبیک کہیے، اور اگر بیماری دنیا بھی اس کے اتباع سے جی چرا رہی ہو تو یقین کیجیے کہ اس سے آپ کی اپنی ذمہ داریوں میں کوئی کمی واقع نہیں ہو سکتی، اور نہ آپ کو یہ حق حاصل ہو سکتا ہے کہ دوسروں کے عمل اور عزم کا انتظار کرتے رہیں۔ یہ انتظار تو حق پرستی کی ضد ہے اور جو شخص حق کو مانتے ہوئے انتظار کی پالیسی اختیار کرتا ہے وہ دراصل حق کو بدنام کرتا اور اس کی بے حرمتی اور تضحیک کا سامان مہیا کرتا ہے۔ اگر ہمیں صاف گوئی پر معاف کیا جائے تو ہم اس موقع پر اس رسوائے عالم گروہ کی عادات و خصوصیات کو یاد دلائیں جس نے رسول اور اصحاب رسول کے مجاہدات اور اقامت دین کے سلسلہ میں یہی تربص کی پالیسی اختیار کر رکھی تھی، جس کے واسطے مسلمانوں کا ساتھ دینے کے لیے یہ احساس فرض کافی نہ تھا کہ یہ لوگ جس امر حق کے لیے جاں فروشی کر رہے ہیں اسی کو ہم نے بھی اختیار کیا ہے اس لیے ان کے پہلو بہ پہلو چل کر اپنے فرض کو ادا کر لیں۔ اس کے برعکس ان لوگوں کا وطیرہ یہ تھا کہ اس کشمکش سے علیحدہ رہ کر اس کے نتائج کا اندازہ

لگاتے رہتے اور اس وقت مسلمانوں کی جماعت میں آملتے جب ان کی فتح کے جھنڈے لہراتے دیکھ لیتے (اَلَّذِیْنَ یَتَرَبَّصُوْنَ بِکُمْ فَاِنْ کَانَ لَکُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰہِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَکُنْ مَّعَکُمْ) غور فرمائیے کہ ان لوگوں کی ذہنیت، جو اقامت دین کو اپنا فرض منصبی سمجھتے ہوئے بھی اس کے لئے آمادۂ عمل نہ ہوتے، کتنی بنیادی مشابہت رکھتی ہے اس ذہنیت کے ساتھ جس پر منافقوں کے طرز عمل کی اساس تھی؟ جس طرح وہ حق کی حمایت، حق کی خاطر نہیں کرتے تھے، اسی طرح ان لوگوں کے نزدیک بھی حق کا مجرد حق ہونا ہی آمادگی عمل کے لئے کافی نہیں، فرق اگر ہے تو صرف یہ کہ وہ لوگ مسلمانوں کی فتح کا انتظار کیا کرتے تھے، اور یہ حضرات قیام دین کے داعیوں کے عزم واخلاص کے بارے میں کسی "شرح صدر" کے منتظر ہیں لیکن اتباع حق اور ادائے فرض سے بھاگ رہے ہیں دونوں ہی تشنہ کام ہیں۔

بدبختی کی انتہا | کاش معاملہ یہیں ختم ہو جاتا اور ان سب لوگوں نے انتظار اور تربص کے صرف سلبی پہلو پر ہی اکتفا کر لیا ہوتا۔ مگر یہ دیکھ کر صبر اور ضبط کا دامن سنبھالنا دشوار ہو جاتا ہے کہ خدا پرستی، اتباع قرآنی اور عشق محمدی کی دعویدار امت میں ایسے افراد بھی موجود ہیں جو اس ساعت ہمایوں کے انتظار میں شوق مجسم بنے بیٹھے ہیں، جب طاغوتی اقتدار کی لال پیلی آنکھیں دیکھ کر اقامت دین کے "جھوٹے مدعی" میدان سے بھاگ کھڑے ہوں گے۔ اور انھیں اپنے جذبات طعن وتشنیع کی تسکین دہی کا موقع نصیب ہو گا۔ یہ حضرات، ایک سنجیدہ تبسم کے ساتھ یہ فرما کر گویا اپنی ذمہ داریوں

کا حق ادا کر دیتے ہیں کہ ہوش سے عاری اور جوش کے اندھے لوگوں کا ایک
گروہ ہے جو قیامِ دین قیامِ دین کا شور مچا رہا ہے، حوادث و مشکلات خود ہی
ان کا فاتحہ پڑھ دیں گے، لیکن شاید انھیں خبر نہیں کہ ان کے اس نشترِ طعن
کی زد خود ان کی اپنی رگِ گلو تک جا پہنچتی ہے۔ افسوس! مسلمان کا دل
اب قیامِ دین کی حسرتوں سے بھی اب اس درجہ محروم ہو گیا ہے کہ اگر خود نہیں
کچھ کر سکتا تو دوسروں کا کچھ کرنا بھی اس کو گوارا نہیں رہا۔ اور نہ اس کی
نیک خواہشات کا اس کے دل میں گذر باقی رہا۔ آخر یہ باور کرنے کے لئے کہاں
سے دل و دماغ لائے جائیں، کہ جو سینہ دینِ حق کی محبت اور فدویت کا امین
بنایا گیا تھا اب اس میں ان آرزوؤں کی پرورش کی جا رہی ہے، جو صرف
مساعیِ کفر کے تعلقات مخصوص ہونی چاہئیے تھیں، حالانکہ اگر میرے اندر اتنی
غیرت اور ہمت موجود نہیں ہے کہ اللہ کے دین کو زندہ اور قائم کرنے کے
لئے قدم بڑھا سکوں تو میرے ایمان کا کم سے کم تقاضا یہ ہونا چاہئیے کہ اس
کی تمنا سے اپنے قلب و دماغ کو ایک لمحہ کے لئے بھی خالی نہ ہونے دوں،
اور اگر کچھ اللہ کے بندے اس کے لئے قدم اٹھا رہے ہوں تو ان کے لیے
اخلاصِ عمل، ثباتِ قدم، نصرتِ حق، حسنِ انجام اور فوزِ مرام کی دعائیں کروں
لیکن اگر اتنا بھی نہیں ہو سکتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ غیرتِ حق کی آخری
چنگاری بھی میرے اندر بجھ رہی ہے، اور اگر اس سے آگے بڑھ کر میں اس
دعوتِ حق کو فتنہ قرار دے دوں، لوگوں کو اس کی طرف بڑھنے سے روکنے
لگ جاؤں اور اس کے لئے حوادثِ روزگار کی تمنائیں کروں، تو میری بدبختی

کی یہ انتہا ہوگی، اور ایسی صورت میں مجھ کو اسلام کا نام لیتے ہوئے شرم معلوم ہونی چاہیئے۔ کیونکہ حالات اور مظاہر کے تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ میں بالکل اسی مقام پر ہونگا جہاں سے کچھ کور باطن لوگ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے فداکار ساتھیوں کو اس نگاہ سے دیکھ رہے تھے جس کا ذکر قرآن نے ان لفظوں میں کیا ہے:—

..... یَتَرَبَّصُ بِکُمُ الدَّوَائِرَ — یہ لوگ تمہارے نذر آفات ہونے کا انتظار کر رہے ہیں۔ (توبہ — ۱۸)

یا پھر وہاں، جہاں سے پیغمبر عالم کی دل نشین اور مسحور کن صدائے حق کو یہ کہہ کر ٹالا گیا تھا کہ:

شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَیْبَ الْمَنُوْنِ — یہ ایک (سحر طراز) شاعر ہے۔ ہم اس کے لیے حوادث روزگار کی راہ دیکھ رہے ہیں۔ (طور — ۳)

پس جنہیں اللہ نے عقل دی ہے، انہیں پوری سنجیدگی اور احساس ذمہ داری کے ساتھ اس طرز عمل پر غور کرنا چاہیئے جو نری جہالت کی پیداوار ہے اور جس کے ساتھ ایمان کی محبت کبھی جمع نہیں ہو سکتی۔

مہدی موعود کے منتظر

آخری گروہ اُن لوگوں کا ہے جو مہدی موعود کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔ ان کے فکر و استدلال کا نقطۂ آغاز یہ ہے کہ آنحضرت صلعم نے تیس سال کے بعد خلافت راشدہ کے ختم ہو جانے اور پھر قرب قیامت میں امام مہدی کے ہاتھوں سے

کے از سرِ نو قائم ہونے کی خبر دی ہے"۔ اور نقطۂ انجام یہ ہے کہ "اس نصب العین کے برحق ہونے کے باوجود اب ہم اس کی اقامت کے مکلف نہیں"۔ دین اور اس کے اصول و مطالبات سے بے خبری کا یہ عالم ہے کہ اب اس قسم کی باتوں کو بھی دلیل سمجھا جاتا ہے اور اتنی زبردست دلیل، جو مسلمانوں کی زندگی کا نقشہ تک ہی بدل سکتی ہے، ضرورت تو تھی کہ اس قسم کی بے اصل باتوں کی تردید میں وقت، کاغذ، اور روشنائی کا ضیاع برداشت کیا جاتا، مگر اس مصیبت کا کیا علاج کہ اس افیون کی گولی نے نہ صرف ہمارے عوام بلکہ کتنے ہی مدعیانِ علم اور اربابِ تقویٰ کو مدہوش اور بے حس بنا رکھا ہے، اس لیے انہیں بتا دینے کی ضرورت ہے کہ جس دیوار کا تم نے سہارا لے رکھا ہے اس کی بنیاد ریت سے اٹھائی گئی ہے تا کہ جس کو فرض کی ہلاکت منظور ہو پورے علم و شعور کے ساتھ منظور رہے۔

روایاتِ مہدی کی حیثیت سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ ظہورِ مہدی کی خبر ہمیں ملی کہاں سے ہے اور حقائقِ دینی کی فہرست میں اس کا مقام کیا ہے۔ ہر صاحبِ علم جانتا ہے کہ قرآن کے صفحات اس کے ذکر سے بالکل خالی ہیں حالانکہ اگر تعلیماتِ دین میں اس امر کو کوئی ایسی اہمیت، جو ہماری زندگی کا مقصد ہی بدل دے سکتی ہو، حاصل ہوتی تو عقلِ عام چاہتی ہے کہ قرآن اس کے متعلق ہم کو واضح ہدایتیں دیتا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ لے دے کے اس کا ذکر روایتوں میں آتا ہے، مگر یہ روایتیں بھی اس پایہ کی نہیں کہ طبقۂ اولیٰ کی کتبِ حدیث میں سے کسی ایک کے اندر بھی وہ بار نہ پا سکیں۔ نہ امام بخاری نے ان کو درخورِ

اعتنا سمجھا، نہ امام مسلم نے، نہ امام مالک نے، صرف بعد کے طبقہ کی کتابوں میں یہ دکھائی پڑتی ہیں۔ لیکن جب ان کو محدثانہ معیارِ تحقیق پر پرکھ کر دیکھا جاتا ہے تو ایک روایت بھی کھری ثابت نہیں ہوتی، اور ان کے اکثر و بیشتر راوی شیعہ نکلتے ہیں۔ روایت کے الفاظ پر نگاہ ڈالیے تو ان میں صاف طور پر شیعوں کے مخصوص عقائد اور خیالات کی روح جھلکتی نظر آتی ہے۔ یہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر علمائے محققین کا ایک گروہ ان احادیث کو افسانہ سے زیادہ حیثیت نہیں دیتا۔

نرالی منطق

لیکن اگر ہم یہ مان بھی لیں کہ یہ احادیث موضوع نہیں ہیں، اور فی الواقع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ظہورِ مہدی کی پیشین گوئی کی ہے، تو سوال یہ ہے کہ اس کو اقامتِ دین کے فریضہ سے کیا تعلق؟ اس سے زیادہ سے زیادہ جو چیز ثابت ہوتی ہے وہ اتنی ہی تو ہے کہ اس دنیا کا نظام فنا ہونے سے پہلے ایک دورِ مبارک آئے گا، جب سطحِ زمین کے ایک ایک گوشے سے ظلم اور فساد مٹ جائے گا، دنیا عدل سے بھر جائے گی اور حضرت ابوبکر صدیق اور عمر فاروق کی طرح کی "خلافت علیٰ منہاج النبوۃ" ہفت اقلیم میں قائم ہو جائیگی۔ لیکن اس سے یہ کس طرح لازم آ گیا کہ بیچ کے زمانوں کے لیے ساری دنیا پر کفر و طاغوت کی فرماں روائی مقدر ہو چکی ہے؟ اس میں تو کوئی دور کا بھی اشارہ اس امر کا موجود نہیں ہے کہ خلافتِ راشدہ کے اختتام سے لیکر ظہورِ مہدی تک زمین کے کسی بھی خطہ پر اللہ کا دین قائم نہ ہو گا۔ بخلاف اس کے تاریخ گواہ ہے کہ خلافت راشدہ کے ختم ہونے کے ستر برس بعد ہی حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے ہاتھوں مملکتِ اسلام میں تقریباً وہی بہارِ سعادت پھر آ گئی جو خیر القرون میں تھی

اور اس دور کو بھی خلافت راشدہ کا دور تسلیم کیا گیا، اس کے علاوہ جس پایہ کی ظہورِ مہدی والی روایات ہیں اسی پایہ کی دوسری روایات ایسی بھی ملتی ہیں جن میں صراحت کے ساتھ پیشین گوئیاں کی گئی ہیں کہ مہدی موعود کے علاوہ اور ان سے پہلے اور بھی علمبردارانِ قیامِ دین اٹھیں گے جن کی حمایت و نصرت مسلمانوں پر واجب ہے۔ مثال کے طور پر دو روایتیں ذکر کی جاتی ہیں:-

(١) اذا رأيتم الرايات السود قد جاءت من قبل خراسان فأتوها ولو حبوا على الثلج فان فيها خليفة الله المهدي۔

جب تم یہ دیکھنا کہ خراسان کی طرف سے سیاہ نشانات آ رہے ہیں تو وہاں پہونچنا — اگرچہ تمہیں برف کے اوپر گھسٹ کر کیوں نہ جانا پڑے اس لئے کہ ان نشانات کے اندر اللہ کا ہدایت یافتہ خلیفہ ہوگا۔

(٢) يخرج رجل من وراء النهر يقال له الحارث حراث على مقدمته رجل يقال له منصور يمكن لآل محمد كما مكنت قريش لرسول الله وجب على كل مسلم نصره۔ (ابو داؤد)

ماوراء النہر سے "حارث حراث" نامی ایک شخص نکلے گا جس کا پیش رو (سپہ سالار) منصور نامی ایک آدمی ہوگا، وہ آل محمد کے لئے قوت اور اقتدار پیدا کرے گا جس طرح کہ قریش نے رسول اللہ کے لئے کیا، اس کی مدد کرنا ہر مسلمان پر واجب ہے۔

یہ گمان نہ کرنا چاہئے کہ ان روایتوں میں جن اشخاص کے ظہور کی خبر دی گئی ہے ان سب سے مراد ایک ہی شخص یعنی وہی امام موعود ہیں، کیونکہ مہدی موعود کا ظہور حسب بیان روایات، مدینہ منورہ سے ہوگا نہ کہ ماوراء النہر یا خراسان سے، اسی طرح ان کا نام آنحضرت صلعم کے نام پر ہوگا نہ کہ "حارث حراث" نیز یہ کہ وہ اہل عرب کے حلقہ میں

نکلیں گے نہ کہ خراسانی یا تورانی افواج کو لے کر، پھر یہ غلط فہمی بھی نہ ہونی چاہئے کہ ان روایات میں حصر ہو گیا ہے، اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ان تمام داعیانِ حق کی فہرست گنا دی ہے جو قیامت تک اقامت دین کا حکم لے کر اٹھنے والے ہیں۔ بلکہ ان روایتوں میں، بشرطیکہ وہ صحیح ہوں، صرف بعض افراد اور زمانوں کا ذکر آیا ہے، اور مقصود اس امر کی تاکید ہے کہ جب کبھی بھی ایسے مواقع پیش آئیں تو ہر مسلمان کا فرض ہو جائے گا کہ خدا کی راہ میں اپنے کو پیش کر دے۔

پس ان روایات میں نہ صرف یہ کہ مہدی موعود کے ماسوا بھی حق کے مجاہدوں اور دین قیم کو زندہ و پائندہ کرنے والوں کی آمد کی بشارت سنائی گئی ہے بلکہ ہر مسلمان پر واجب گردانا گیا ہے کہ سر کے بل بھی چلنا پڑے تو چلکر ان دعاۃ حق کے پاس پہنچے اور ان کی اعانت و اطاعت میں جان کی بازی لگا دے۔ اس طرح ان اوہام کی جڑ کٹ جاتی ہے جو مہدی موعود کے نام سے پیدا کر دئے گئے ہیں۔

پھر قطع نظر ان روایات کے، اصل سوال تو فرض زندگی کا ہے۔ جب یہ ثابت شدہ حقیقت ہے کہ اقامت دین کا فریضہ ہر مسلمان کی زندگی کا مقصد وحید اور اسکی خاطر جد و جہد کرنا اس کے ایمان کا معیار و مظہر ہے اور جب مومن کی عین فطرت ہی یہ قرار دی گئی ہے کہ وہ باطل اور منکر کو جینے کا حق نہیں دینا چاہتی خواہ وہ دنیا کے کسی گوشہ میں بھی موجود ہو، اور جب اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اتباع قرآن کے عہد کا سب سے پہلا اور سب سے آخری مطالبہ ہی یہ ہے

کہ انسان کا پائے سعی و جہد اس وقت تک نہ تھمے جب تک کہ دینِ الٰہی کی ایک
دفعہ بھی معطل ہے اور زمین کا ایک ذرہ بھی باطل کے پاؤں تلے دبا ہے، تو
ہر مومن کو یہ جد و جہد لازماً کرنی پڑے گی اور ہر حال، ہر دور، ہر ماحول، اور
ہر جگہ کرنی پڑے گی۔ امام مہدی اگر آئیں گے تو وہ اپنا فرض ادا کریں گے نہ
کہ میرا اور آپ کا، ان کی تمام دوڑ دھوپ اپنے اس بوجھ کو سر سے اتارنے کے
لیے ہوگی جو اللہ رب العالمین کی طرف سے ان پر ڈالا گیا ہوگا، ان کا کوئی فعل
کسی بھی مدعیِ اسلام کے ادائے فرض کا قائم مقام نہ ہوگا۔ نہ تو وہ کسی دوسرے
کے لئے نماز پڑھیں گے نہ روزے رکھیں گے، اور نہ ہی جہاد و قتال کرینگے
آپ آج ہی ان کی مساعی پر تکیہ کئے بیٹھے ہیں، جبکہ ان کا وجود ابھی عالمِ تصور اور
دنیائے آرزو سے باہر بھی نہیں آیا ہے۔ مگر یقین کیجئے کہ وہ اس وقت کے بھی
کسی مسلمان کے عوض تلوار نہ چلائیں گے جو ان کے زمانہ میں موجود ہوگا۔ اس
وقت بھی ہر مسلمان کو اپنا اپنا فرض ٹھیک اسی طرح ادا کرنا ہوگا جس طرح امام
موصوف کو، یعنی حضرت مسیحؑ کے لفظوں میں "ہر شخص کو اپنی صلیب خود اٹھانی
ہوگی" اور جو ایسا نہ کرے گا "آسمانی بادشاہت" میں داخل نہ ہو سکے گا۔
اس لیے ہر مسلمان کو یہ دعا اور یہ آرزو تو ضرور کرنی چاہیئے کہ اس کو وہ دورِ
سعادت دیکھنا نصیب ہو جب امام مہدی اپنی تمام تر برکتوں کے ساتھ
ظہور فرما ہوں گے اور ظلم و فساد کے بوجھ سے کراہتی ہوئی دنیا عدل و قسط
کی رحمتوں سے مالا مال ہو جائے گی۔ مگر ایک لمحہ بھی اس کو اس وہم میں مبتلا
نہ ہونا چاہیئے کہ حضرت موصوف کے صدقہ میں اب سارے مسلمان بندگی کی

ذمہ داریوں یعنی اقامت دین کی جد و جہد سے سبکدوش کردئے گئے ہیں،
جس طرح عیسائی حضرات اس خوش گمانی میں مبتلا ہوگئے ہیں کہ مسیح
علیہ السلام نے سولی پر چڑھ کر ہم کو حسن عمل سے بے نیاز کر دیا ہے۔

احتساب نفس کی ضرورت

اقامت دین سے دامن بچانے والے مسلمانوں
کے یہ پانچ مختلف گروہ ہیں۔ ہم نے کوشش کی ہے کہ ان میں سے ہر گروہ کے
خیالات اور دلائل کو بیان کر کے ان کی غلطی واضح کی جائے۔ توقع ہے کہ ان
معروضات پر ٹھنڈے دل سے اور حق طلبی کے جذبات کے ساتھ غور کیا
جائے گا اور روایتی، گروہی، سیاسی اور تقلیدی تعصبات سے بالاتر ہو کر
خالص خدا پرستانہ نقطۂ نظر سے اپنے مشاغل زندگی کا جائزہ لیا جائیگا۔
یاد رہے کہ نفس اپنا احتساب کرنے میں سخت حیلہ گر اور فریب کار واقع ہوا
ہے۔ اس پر کسی غیر مانوس اور نامطلوب حقیقت کا سامنا کرنا بڑا ہی شاق
ہوتا ہے۔ اور اس حقیقت کے خلاف تو وہ اپنے ترکش دجل کا آخری
تیر تک استعمال کر ڈالتا ہے۔ جو اس سے قربانیوں کی طلبگار ہو۔ صرف
جان اور مال ہی کی قربانیاں نہیں بلکہ جذبات و حسیات کی بھی۔ پندار علم و
فکر کی بھی۔ سابق طرز عمل کی محبت اور عصبیت کی بھی، کہ بسا اوقات ان چیزوں
کی قربانیاں جان و مال کی قربانیوں سے بھی زیادہ دشوار ہوتی ہیں۔ ادھر
سے نور حق کی تجلی چمکتی ہے اور دل پکار اٹھتا ہے کہ سمت قبلہ یہی ہے، ادھر
نفس کے حیلے اور وسوسے اٹھتے ہیں اور انسان سے پوچھتے ہیں کہ کیا اب
تک کی تیری ساری تگ و دو باطل کی راہ میں تھی؟ کیا زمانے کے اقطاب

و ابدال اور وقت کے مراکزِ علم و دانش جن سمتوں کی طرف جا رہے ہیں وہ سب کی سب غلط ہیں؟" یہ سوالات نفسیاتی حربوں سے اتنے مسلح اور اتنے جذبات انگیز ہوتے ہیں کہ انسان ان سے مسحور ہوئے بغیر نہیں رہتا، اور ایک چیز کو حق سمجھنے کے باوجود اسے حق نہیں مانتا۔ یہ نفسِ انسانی کی وہی جبلی کمزوری ہے جو ہر دعوتِ حق کے قبول کرنے سے مانع ہوتی رہی ہے اور ہر نبی کی آواز کے جواب میں بدبخت انسانوں کی زبان سے یہ آواز بلند کرائی رہی ہے کہ:
بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ہم تو اسی چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔

پس نفس کی اس مہلک کمزوری اور دسیسہ کاری سے پوری طرح چوکنے ہو کر اپنے فکر و عمل کا احتساب کرنا چاہیے، اور اس اصول کو کبھی نہ بھولنا چاہیے کہ حق و باطل کا معیار نہ تو کوئی شخص ہے — بجز ایک شخص کے جس کا نام محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہے، اور نہ ہی کوئی جماعت ہے — سوا ایک جماعت کے، جس کو دنیا اصحابِ محمدؐ کے نام سے پکارتی ہے — اس لیے اس سلسلہ میں صرف اللہ کی کتاب، اور اس کے رسول کی سنت، اور اصحابِ رسول کا اسوہ ہی ہمارے سامنے ہونا چاہیے، اگر ان چیزوں میں زندگی کا مقصد اس کے سوا اور کچھ نہیں بتایا گیا ہے کہ اس کا ہر سانس اقامتِ دین کے ذکر و فکر اور سعی و جہد میں بسر ہونا چاہیے تو پھر اس کے بعد اس کے اعتراف اور امتثال میں نہ تو کسی پیر و مرشد کی ارادت مانع ہونی چاہیے، نہ کسی شیخ و امام کی عقیدت، نہ تو کسی استاذ کا تلمذ اس ادائے فرض سے باز رکھنے کا حق

رکھتا ہے، اور نہ کسی جماعت کا تعصب، نہ کسی دیرینہ روش کی حمیت کو اس راہ میں آڑے آنا چاہئیے۔ نہ کسی فکرِ سابق کی عصبیت کو، کہ یہ سب چیزیں نفس کے حجابات اور شیطان کے فتنے ہیں، اور قدرت نے ان کو انسان کے گوش و چشم پر صرف اس لیے پھیلا دیا ہے تاکہ اس کی حق پرستی کی آزمائش ہو۔ مبارک ہے وہ بندہ جو ان حجابوں کو چاک کر کے اور ان فتنوں کو کچل کر اپنے فرض کی پکار پر حرکت میں آ جائے۔ ورنہ یاد رہے کہ اپنے ذاتی رجحانات کی پیچ میں یا اپنے جماعتی افکار و مشاغل کی حمایت و عصبیت میں، یا بزرگوں کی تقلید میں، اس سے گریز کرنا اپنے آپ کو دانستہ نذرِ ہلاکت کرنا ہے۔ کسی بزرگ کا طرزِ عمل ہم کو خدا کی گرفت سے بچا نہیں سکتا، جب تک یہ رازِ حق دل پر نہ کھلا ہو۔ انسان کسی حد تک تو معذور تصور کیا جا سکتا ہے، مگر جب حقیقت بے حجاب نظر آ گئی، اور دل نے اس کی صداقت کا اعتراف کر لیا تو بس یوں سمجھئے کہ اللہ کی حجت تمام ہو گئی۔ اس وقت اعتذار کے سارے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ اب آگے یا تو آمادگیٔ عمل اور کامرانی و نجات ہے یا پھر انکارِ فرض و حصولِ نامرادی۔ کیونکہ حق کو حق سمجھ لینے کے بعد اس سے انکار اور اعراض کرنا اس سنتِ فرعونی کی پیروی کرنا ہے جس کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ:۔

فَلَمَّا جَاءَتْهُمْ آيَاتُنَا مُبْصِرَةً قَالُوا هَٰذَا سِحْرٌ مُّبِينٌ وَجَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنفُسُهُمْ

جب فرعون اور اس کے پیرووں کے سامنے ہماری نشانیاں بالکل کھلے طور پر آئیں تو انھوں نے کہا یہ تو نرا جادو ہے، اور باوجود اس کے کہ ان کے

ظُلۡمًا وَّعُلُوًّا۔ دل ان نشانیوں کی حقانیت پر یقین رکھتے تھے انھوں نے ظلم اور سرکشی کی بنا پر انکو ماننے سے انکار کر دیا!

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ کتنے ہی لوگ اس سُنت کے پیرو ہیں اور ــــ "ظلم وعلو" نہ سہی ــــ گروہ پرستی اور اکابر پرستی کے باعث جَحَدُوْا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا أَنْفُسُهُمْ کے مرض میں مبتلا ہیں۔ کاش اس مرض کی خطرناکی کا احساس کیا جاتا اور جو راہ اللہ نے ان پر کھول دی ہے اس پر چلنے سے کوئی تعلق مانع نہ ہوتا۔ ورنہ ہمیں خطرہ ہے کہ یہ اعتراف حق ان کے جرم کو کچھ ہلکا کرنے کے بجائے اُلٹا سخت کر دیگا۔

آخری گذارش | ابتدائے بحث سے لے کر یہاں تک جو کچھ عرض کیا گیا اُس کا مدعا صرف یہ ہے کہ امت مسلمہ جس نصب العین کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر لی ہے اس کا حق ادا کرے۔ جن اصولوں پر اس کے وجود کی بنا رکھی گئی ہے ان کو از سر نو اپنا مرکز عمل بنا لے، اور حالات زمانہ، مشکلات ماحول اور مصالح وقت سے صرف نظر کر کے، نیز نفس و شیطان کے اختراع کیئے ہوئے حیلوں اور وسوسوں سے دل و دماغ پاک کر کے اپنے چھوڑے ہوئے فرض زندگی کو سر انجام دینے میں لگ جائے۔ بلاشبہ یہ بڑی کٹھن راہ ہے اور اس کا ہر قدم کانٹوں سے بھرا ہوا ہے مگر رضائے حق کی بارگاہ تک جانے والی اس کے سوا کوئی دوسری راہ نہیں۔ مقصد حیات کی اس توضیح اور تبلیغ کے بعد آخری گذارش یہ ہے کہ جن لوگوں کے تلوے ان کانٹوں کا خیر مقدم کرنے کی ہمت نہیں رکھتے اُن کے لئے آخری

چارہ کار جس کو برداشت کیا جا سکتا ہے، یہ ہے کہ وہ جہاں ہیں وہیں قدم روکے کھڑے رہیں" اور کم از کم دوسرے پوچھنے والوں کو تو یہ ضرور بتا دیں کہ گو ہم میں اس راہِ دشوار گذار کو طے کرنے کی ہمت نہیں، مگر حق اور نجات کی شاہراہ یہی ہے۔ یہ اس لئے تاکہ کل اللہ تعالیٰ کے روبرو ترکِ فرض کے ساتھ ساتھ کتمانِ حق کے جرم میں بھی نہ ماخوذ ہوں۔ اور اگر بدقسمتی سے یہ بھی ممکن نہ ہو تو اپنے قدموں کی طرح اپنی زبانوں کو بھی روکے رہیں۔ مگر خدارا دوسروں کو اس راہ سے روکنے کا بوجھ اپنی گردن پر نہ لیں۔

یہ "صدعن السبیل" کی وہ لعنت ہے جس کے تصور ہی سے ایک مسلمان کے رونگٹے کھڑے ہو جانے چاہئیں۔ یہ بعینہٖ وہی روش ہے جو سیدنا مسیح علیہ السلام کے زمانہ میں اشقیائے یہود نے اختیار کی تھی، اور جس کے جواب میں حضرت مسیحؑ نے فرمایا تھا:۔

> "اے ریاکار فقیہو! اور فریسیو! تم پر افسوس ہے کہ تم خدا کی بادشاہت لوگوں پر بند کرتے ہو۔ نہ آپ داخل ہوتے ہو اور نہ داخل ہونے والوں کو داخل ہونے دیتے ہو۔"

خدا نہ کرے کہ کوئی مسلمان اس حد تک آپ اپنی دشمنی پر کمربستہ ہو جائے، اور خود تو اقامتِ دین کی جدوجہد سے جی چراتا ہی ہو۔ اوروں کو بھی اس سے باز رکھنے کا موجب بنے۔

اقامتِ دین کے اصول و مناہج

جب یہ بات واضح ہو چکی کہ ہماری زندگی کا نصب العین بہر حال اللہ کے

دین کو قائم کرنا ہے تو اب ہمیں اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ اس نصب العین کے حصول کا طریقہ کیا ہے؟ آیا اس کا کوئی مخصوص طریق کار ہے یا جس سمت سے چاہیں اس گول کی طرف مارچ کر سکتے ہیں؟ جن لوگوں نے اجتماعیات کا سرسری مطالعہ بھی کیا ہوگا، ان کے لیے یہ معلوم کر لینا چنداں دشوار نہیں کہ ہر جماعت کا، جو کسی خاص مقصد کو لے کر اٹھی ہو، جس طرح ایک مخصوص طریق فکر اور زاویۂ نگاہ ہوتا ہے اسی طرح اس کی تاسیس، تعمیر اور تنظیم کا انداز بھی مخصوص ہوتا ہے۔ اس طریق فکر، اس زاویۂ نگاہ اور اس انداز تعمیر کا تعیین وہی مقصد کرتا ہے جس کو لے کر یہ جماعت اٹھی ہے۔ مثلاً اگر آپ کو ایک نیشنل اسٹیٹ قائم کرنا ہو تو اس کے لیے ضرورت ہے کہ آپ اپنے مخاطبین کے دلوں کو وطن اور قوم کے عشق اور احترام سے معمور کریں، اپنے اوپر آپ حکمران ہونے کا عقیدہ اور عزم پیدا کریں، پھر قومی ناموس کی قربان گاہ پر نثار ہو جانے کے لیے ان کے اندر سرفروشی کے جذبات پیدا کریں۔ جب یہ سب آپ کر لیں گے اور اس طرح کے آدمی آپ کے ارد گرد جمع ہو جائیں گے، تو سمجھئے کامیابی کی تمام شرطیں آپ نے پوری کر لیں، آپ کو یہ دیکھنے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں کہ جو آپ کے جھنڈے کے نیچے جو لوگ جمع ہیں، وہ توحید کے متعلق، رسالت کے متعلق اور قیامت اور جزائے عمل کے متعلق کیا عقیدہ رکھتے ہیں؟ ان کے اندر مذہب کی پابندی کتنی ہے؟ انھوں نے احسان و تقویٰ، عدل و انصاف، رحم و مروت، عفت و پاکدامنی، جود و سخاوت وغیرہ اوصاف سے اپنے کو کہاں تک آراستہ

کرلیا ہے؛ ان میں سے کسی چیز کو دیکھنے کی حاجت نہیں، کیونکہ جو مقصد اور نصب العین آپ کے سامنے ہے اس کے لیے یہ چیزیں سرے سے مطلوب ہی نہیں، بلکہ شاید کچھ مضر ہی ہوں۔ یہاں تو جو شئے مطلوب ہے وہ صرف حریف کی غیر مشروط عداوت و مخالفت اور قوم، قومی اقتدار، قومی وقار اور قومی عروج کی انتہائی شیفتگی اور فداکاری ہے۔

اسی طرح اگر آپ ایک ملک میں کمیونزم کا اقتدار اور کمیونسٹ نظام قائم کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو پہلے وہاں کے باشندوں کے ذہنوں میں کمیونسٹ فلسفۂ زندگی، کمیونسٹ نظامِ معیشت و حکومت اور کمیونسٹ نظریۂ اخلاق کی خوبیاں اتارنی ہوں گی، سرمایہ داری کے خلاف دلوں میں شدید نفرت پیدا کرنی ہوگی۔ مارکس اور لینن کے ساتھ وہ عقیدت پیدا کرنی ہوگی جو خدا اور پیغمبر کے لیے اہلِ مذہب کے دلوں میں ہوا کرتی ہے۔ اور خدا، رسول، مذہب، آخرت، اخلاق اور اعمالِ صالحہ کے الفاظ کو خود غرض سرمایہ پرستوں کے ہتھکنڈے قرار دے کر اور ان کے نقوش و اثرات کو ذہنوں سے مٹا کر خالص مادی تصورِ حیات اور حیوانی تصورِ کائنات ان پر ثبت کرنا ہوگا۔ پھر جب آپ یہ بنیاد جما لیں گے، اور یہ خیالات اور نظریات ایک معقول تعداد میں لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیں گے تو ان سب کو ایک جتھے میں منسلک کر کے ایک طرف باقی عوام کو اپنے پروپیگنڈے کے زور سے مسحور کرنے کی جدوجہد جاری رکھیں گے اور دوسری طرف خفیہ اور علانیہ، تمام ممکن ذرائع سے موجودہ نظامِ حکومت کے تخت کو الٹنے کی مہم شروع کر دیں گے۔ تا آنکہ عوام کے ہاتھوں

یہ تخت الٹ کر اشتراکی حکومت قائم ہو جائے۔

علیٰ ہذا القیاس اگر ایک شخص منظم طریقہ پر رہزنی کرنا چاہتا ہو تو وہ ایسے لوگوں کو تلاش کرے گا جو مضبوط جسم، بے خوف دل اور سفاک فطرت رکھتے ہوں۔ ایسے آدمی اسکے کسی کام کے نہ ہونگے جو نرم دل، اور غارت گری و خونریزی سے متنفر ہوں۔ پھر اپنے مقصد کے مطابق لوگوں کو جب وہ حاصل کرلے گا تو ان صفاتِ مطلوبہ کا ان میں مزید استحکام پیدا کرنے کی تدبیریں کرے گا، لوٹ مار کے اخیں گر سکھائے گا، اسلحہ مہیا کرے گا، تب کہیں جا کر اپنی مہم کا آغاز کر سکے گا۔

غرض دنیا کی ہر با مقصد جماعت کا یہی حال ہے کہ وہ ہمیشہ ایسے ہی لوگوں کو اپنے اندر جگہ دیتی ہے جو اس کے پیشِ نظر مقصد سے قلبی لگاؤ رکھتے ہوں اور لازماً ایسے ہی طریق کار اور ایسی ہی پالیسیاں اختیار کرتی ہے جو اس مقصد کے مزاج سے پوری طرح ہم آہنگ ہوں۔ "امتِ مسلمہ" کہلانے والی جماعت اور قیامِ دین کا مقصد بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتا۔ اس مقصد کے حصول کے لیے بھی ایک خاص طریق کار ہونا چاہیئے۔ آیئے دیکھیں وہ طریق کار کیا ہے؟

اس غرض سے جب ہماری نگاہ اٹھتی ہے تو فطرۃً وہ قرآن اور سنت پر ہی جا کر ٹھیرتی ہے۔ اور جب واپس لوٹتی ہے تو طمانیت کی ٹھنڈک لے کر لوٹتی ہے جس طرح قرآن اور صاحبِ قرآن نے اقامتِ دین کے نصب العین کو پوری تشریح اور وضاحت کے ساتھ ہمارے سامنے رکھ دیا ہے۔ اسی طرح اس کے طریق کار کے بارے میں بھی کسی حجاب کو حائل نہیں ہونے دیا ہے، بلکہ ایک دیدۂ بینا کو

یہ طریقہ قرآن و سنت کے صفحوں میں اسی طرح نمایاں نظر آتا ہے جس طرح اندھیری راتوں میں آسمان کے سینہ پر کہکشاں۔ قرآن، قرآن کے لانے والے اور قرآن کے بھیجنے والے تینوں نے اس طریق کار کی طرف رہنمائی کی ہے۔ جو کہنے میں تو تین الگ الگ وجود ہیں مگر زیر بحث مقصد کے اعتبار سے تینوں دراصل ایک ہی ہیں۔

قرآنی اصول و نکات | قرآن کو غور سے پڑھئے اور اس کی تمام تعلیمات کو مجموعی طور پر سامنے رکھئے تو بڑی آسانی اور وضاحت کے ساتھ وہ اصول و نکات ہاتھ آجاتے ہیں جن پر اقامت دین کی جد و جہد کی جانی چاہئیے۔ اور یہی اصول و نکات دراصل تعلیمات قرآن کا مکھن ہیں۔ یعنی از روئے حقیقت سارے قرآن کی بحث کا مرکز یہی ایک مقصد — مقصد اقامت دین — ہے اور اس کی ساری ہی تفصیلات اسی مقصد کے اصول کی شرح ہیں لیکن اس حقیقت کو جاننے اور اس مکھن کو حاصل کرنے کے لئے قرآن کے چشمۂ حیوان کو اچھی طرح متھنے کی ضرورت ہے جس کے لئے کافی وقت درکار ہے اس لیے ہم اس موقع پر قرآن کی صرف ان آیتوں کی طرف توجہ دلائیں گے جو مسلسل ایک ہی رکوع میں درج ہیں اور ہمارے مبحث کے لحاظ سے گویا پورے قرآن کا خلاصہ ہیں یعنی اقامت دین کے جو اصول و نکات قرآن کے سیکڑوں صفحات میں پھیلا کر بیان کئے گئے ہیں وہ یہاں چند سطروں میں سمیٹ دیئے گئے ہیں۔ یہ آیتیں اقامت دین کے طریق کار کے نہ صرف عملی اصولوں ہی کی وضاحت کرتی ہیں بلکہ اس کے ساتھ ہی ان اصولوں کی ترتیب اور اس نصب العین کے فطری ارتقاء کے

تدریجی ادوار و مراحل کی نشاندہی بھی کرتی ہیں، اس لیے ان آیتوں کو ایک بار ترتیب کے ساتھ پڑھ لیجیے :-

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ كُنْتُمْ أَعْدَاءً فَأَلَّفَ بَيْنَ قُلُوبِكُمْ فَأَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهِ إِخْوَانًا ... . وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ....

اے ایمان لانے والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو، جیسا کہ تقویٰ کا حق ہے اور تم کو موت نہ آئے، مگر اس حال میں کہ تم مسلم ہو۔ اور تم سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو، اور ٹولی ٹولی نہ ہو جاؤ۔ اللہ کے اس احسان کو یاد رکھو جو تم پر ہوا ہے جب کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے، تو اس نے تمہارے دل باہم جوڑ دیئے اور اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی ہو گئے ...... اور چاہیے کہ تم میں ایک گروہ ہو جو لوگوں کو بھلائی کی طرف بلائے، نیکی کا حکم دے اور بدی سے روکتا رہے۔ ایسے ہی لوگ فلاح یاب ہوں گے، اور دیکھو کہیں تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو واضح ہدایتیں پانے کے باوجود ٹولیوں میں بٹ گئے اور اختلافات میں مبتلا ہو گئے۔

(آل عمران - ۱۱)

ان آیات کا زمانہ نزول مدینہ کی ابتدائی زندگی یعنی ۲ھ یا ۳ھ ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب امت مسلمہ کی اجتماعی اور سیاسی زندگی تاسیس و تعمیر کے

ابتدائی مرحلوں سے گذر رہی تھی جبکہ اس زمانہ میں یہ آیات کریمہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اقامت دین اور نظام مومنین کا ایک مختصر مگر جامع ربانی پروگرام لے کر آئیں۔ اس ربانی پروگرام پر غور کیجئے تو بالترتیب اس کے حسب ذیل تین اجزاء یا تین نکات نظر آتے ہیں:۔

(۱) التزام تقویٰ۔ (۲) اعتصام بحبل اللہ (۳) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

ان نکات سہ گانہ کو تفصیل کی روشنی میں دیکھئے۔

(۱) التزام تقویٰ

پہلی چیز جو اقامت دین کے سلسلہ میں مطلوب ہے، اور جس کو اس قصر کا سنگ بنیاد کہنا چاہئے اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقَاتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ہے۔ یعنی ہر وہ فرد جو ایمان کا مدعی ہو اور جو اس فرض کو ادا کر کے اپنے سر سے بندگی کا ذمہ اتارنا چاہتا ہو، اس کے لئے یہ لازم ہے کہ اللہ کا "تقویٰ" اختیار کرے اور دم واپسیں، ہر آن اور ہر لمحہ ایک "مسلم" کی طرح زندگی بسر کرے۔ تقویٰ کا مفہوم، جو قرآن نے متعین کیا ہے، اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کا ٹھیک ٹھیک اتباع کیا جائے، اور زندگی کے مختلف شعبوں میں اس نے جو حدیں قائم کر دی ہیں ان کی پاسداری کی جائے۔ اس کے کسی امر کی عدم تعمیل سے بھی ڈرا جائے اور کسی نہی کے ارتکاب سے بھی خوف کھایا جائے اور مسلم کے معنی ہیں فرمانبردار اور اطاعت کیش کے، یعنی وہ شخص جس نے اوامر الٰہی کے سامنے رضا کارانہ اپنی گردن جھکا دی ہو۔ تو گویا اقامت

دین کے پروگرام کا پہلا نکتہ یہ ہوا کہ انسان سب سے پہلے خود اپنے اوپر
اللہ کے دین کو قائم کرے۔ خوف و رجا کی ساری نیاز مندیاں بس اسی
ایک ذات کے لیے مخصوص کر دے اور تسلیم و تعظیم اور تذلل و تواضع کے
تمام جذبات اسی کی رضا جوئی میں نثار کر دے۔ تمام طاقتوں سے منہ
موڑ کر اسی ایک آقا کی اطاعت کا حلقہ اپنی گردن میں ڈال لے۔ اپنے نفس
کو ان تمام رذائل سے پاک کرے جو ناخوشنودی رب کے موجب بنتے ہوں
اور ان تمام محاسن سے آراستہ کرے جو رضائے الٰہی کے باعث ہوں۔
اپنے کو اللہ تعالیٰ کا ہمہ وقتی غلام سمجھتا رہے اور اس کے کسی حکم کی بجا آوری
میں نہ تو لیت و لعل کرے اور نہ دل تنگ ہو۔ اپنی نگاہ کو رضائے حق اور امتثال
امر رب پر پوری طرح جمائے رہے خواہ کتنی ہی مخالفتیں، مصیبتیں، ناسازگاریاں
اور دل شکنیاں اس کی راہ میں کیوں نہ حائل ہوں۔ کہ دراصل یہ ساری
مشکلات و مصائب نہیں ہیں بلکہ اتباع حق اور التزام تقویٰ کی وہ امتحان
گاہیں ہیں جن سے گزرے بغیر کسی مدعی ایمان کا ایمان و اتقا خدا کے ہاں
سند اعتبار اور شرف قبول نہیں حاصل کرتا۔ جیسا کہ قرآن کا فیصلہ ہے۔

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ
وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَ
الْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ
الصَّابِرِينَ الخ (بقرہ ۲۰)

ہم ضرور تم کو (یعنی تمہارے اور تمہارے ایمان کو)
خطروں اور فاقوں اور تمہارے مال و جان اور
پیداوار کے نقصانوں کے ذریعہ آزمائیں گے
اور اے نبی! اُن لوگوں کو کامرانی کا مژدہ سنا دو
جو ان خطرات و نقصانات کو صبر و ضبط کے ساتھ

برداشت کرلیں الخ

أَحَسِبَ النَّاسُ أَنْ يُتْرَكُوا أَنْ يَقُولُوا آمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُونَ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللَّهُ الَّذِينَ صَدَقُوا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكَاذِبِينَ (عنکبوت - ۱)

کیا لوگوں نے یہ گمان کر رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہہ دینے پر چھوڑ دیئے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور انھیں پرکھا نہ جائے گا؟ حالانکہ (یہ آزمائش ہماری ہمیشہ کی سنت ہے اور) ہم نے ان سے پہلے بھی لوگوں کو پرکھا ہے۔ سو یقین رکھو کہ اللہ تعالیٰ یہ ضرور دیکھے گا کہ تم میں سے کون سچے ہیں اور کون جھوٹے۔

پس ان چیزوں سے گھبرانے کے بجائے ان کا خوش دلی کے ساتھ خیر مقدم کرنا چاہیئے، ورنہ وہ دل ایمان کا لذت شناس نہیں ہو سکتا جو ان عوائق سے ڈر کے پیچھے الٹے پاؤں پھرے اور وہ تقویٰ کے اس مقام سے بہرہ یاب نہیں ہو سکتا۔ اسکی آزمائش کی ہمت نہ رکھتا ہو تو ایسا شخص جو حدود اللہ کی پاسداری اور احکام قرآنی کی پیروی میں اپنے جانی، اور مالی، گروہی اور طبقاتی، قومی اور وطنی مفادات کا بچاؤ پہلے پیش نظر رکھے، اور اتباع حق کو جان و مال کی کامل حفاظت کے ساتھ مشروط رکھتا ہو۔ ایسے شخص کی زبان پر اسلام، اور اس کی شکل و صورت میں تقویٰ تو ہو سکتا ہے مگر اس کا باطن ان طائران قدس کا آشیانہ نہیں بن سکتا۔ غرض ابتلائے مومنین اللہ تعالیٰ کی ایک عام سنت ہے، اور اسی سنت کو پوری کرنے کے لئے اس نے اسلام اور اتقا کا راستہ مشکلات اور مصائب کی چٹانوں سے بھر رکھا ہے۔ اس لیے جو شخص اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ کے فرمانِ الٰہی کی تعمیل کرنا چاہتا ہو اس کو ان چٹانوں سے

ٹکرانا اور ان کی ٹھوکریں برداشت کرنا ناگزیر ہے۔

(۲) اتحاد و تنظیم

اس پروگرام کی دوسری دفعہ یا دوسرا نکتہ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا کے الفاظ میں بیان ہوا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمام اہلِ ایمان جو اپنی انفرادی اصلاح و تزکیہ میں کوشاں اور احکامِ الٰہی و حدودِ خداوندی کی پابندی میں سرگرمِ عمل ہوں، مل کر ایک مضبوط اور منظم جماعت بن جائیں، اور ان کو باہم جوڑنے اور متحد کرنے والی چیز نہ تو کوئی نسلی رشتہ ہو نہ کوئی وطنی مفاد، نہ کوئی معاشی و سیاسی غرض ہو، نہ کوئی دنیوی اور مادی مقصد، بلکہ صرف اللہ کی "رسی" یعنی وہ کتاب ہو جس کو قرآن کہا جاتا ہے، وہ شریعت ہو جس کی پیروی کا ہر مومن نے عہد کیا ہے، وہ دین ہو جس کی اطاعت و اقامت کے لیے بندگانِ خدا کی آفرینش ہوئی ہے۔ پس یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ اسلام کے نزدیک نفسِ اتحاد ہی کوئی مطلوب و محبوب شئے ہے۔ اگر اتحاد کی بنیاد کسی فاسد مقصد پر رکھی گئی ہو، تو نہ صرف یہ کہ وہ اسلام کا مطلوب نہیں بلکہ اس کی نظروں میں وہ حد درجہ مردود و مبغوض ہے اور اس اتحاد سے بال برابر بھی مختلف نہیں جو چوروں اور ڈاکوؤں کے مابین ہوا کرتا ہے۔ اسلام کا مطالبہ اس اتحاد و ائتلاف کا ہے جس کا شیرازہ اتباعِ حق اور اقامتِ حق ہو۔

اقامتِ دین کا یہ نکتہ یعنی اتحادِ امت، اگر ذرا غور کیجئے تو پہلے نکتہ سے کوئی بالکل الگ اور متغایر شئے نہیں ہے بلکہ اسی کا ایک فطری تقاضا ہے

ایک طالب علم کو اس کی اپنی طبیعت مجبور کرتی ہے کہ اپنے رفقائے درس سے بے تکلفی، دل بستگی اور الفت و محبت رکھے۔

ایک صاحب علم کی فطرت چاہتی ہے کہ ارباب علم و دانش کی ہم نشینی اختیار کرے۔ ایک رنگین طبع اپنے جیسے رنگین مزاجوں کی طرف کھنچ اٹھنے سے اپنے آپ کو روک نہیں سکتا۔ اور اگر کسی طالب علم کو اپنے رفقا سے، کسی صاحب علم کو علماء و افاضل سے، کسی رنگین مزاج کو اپنے ہم مشربوں سے کوئی گہری وابستگی نہ ہو تو یقین کرنا چاہئے کہ وہ صحیح معنوں میں طالب علم صاحب علم اور رنگین طبع نہیں ہے۔ یہی وہ کشش ہے جس کو عام اصطلاح میں جاذبۂ جنسیت کہا جاتا ہے۔ اور یہی جاذبۂ جنسیت اہل تقویٰ کے درمیان بھی اپنا کام کرتا ہے۔ ایک وہ انسان جو خدا پرستی اور اتباع احکام قرآنی کے جذبات سے سرشار ہو، لازمی طور پر ان لوگوں کی طرف کھنچے گا جو اسی کی طرح اتباع حق اور تقویٰ کے رنگ میں رنگے ہوئے ہوں، یہ ممکن نہیں ہے کہ دو دلوں میں خدا کا حقیقی تقویٰ موجود ہو، لیکن وہ آپس میں کٹے ہوئے ہوں۔ ان میں جذب و انجذاب لازمی ہے، اور اگر ایسا نہ ہو تو سمجھنا چاہئے کہ تقویٰ کی صورت میں اندر کوئی دوسری ہی روح پرورش پا رہی ہے۔ ایک ہی منزل اور ایک ہی راہ کے دو مسافر ایک دوسرے کے غیر بن کر نہیں رہ سکتے یہی راز ہے جو آپ دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کی تعریف کہیں اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ کے الفاظ سے کی گئی ہے، اور کہیں رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ ان کی علامت فارقہ بتائی گئی ہے، کہیں اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ان کا نشان امتیاز ٹھہرایا

گیا ہے۔ گویا اسلام کے مدعیوں اور پیروؤں کا باہم جڑ کر رہنا ان کے ایمان اور اتقا کی کسوٹی ہے۔ پھر دوسری طرف اس رنگ وحدت کو برقرار اور شوخ سے شوخ تر کرنے کے لئے منفی پہلو سے بھی اس پر روشنی ڈال دی گئی ہے۔ اور تصریح کے ساتھ تمام اہل ایمان کو متنبہ کر دیا گیا ہے کہ:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا آبَاءَكُمْ وَإِخْوَانَكُمْ أَوْلِيَاءَ إِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْإِيمَانِ وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ (توبہ۔۳۰)

اے ایمان لانے والو! اگر تمہارے باپ اور بھائی ایمان کے مقابلہ میں کفر کو ترجیح دیں تو ان کو اپنا دلی رفیق نہ بناؤ اور جو ان کو اپنا دلی رفیق بنائیں گے تو وہی ظالم ہوں گے۔

معلوم ہوا کہ جس طرح ایک سچا مومن اور متقی، دیگر اتقیا اور صالحین سے بعد اور کشیدگی نہیں رکھ سکتا خواہ وہ اس کے بیگانے ہی کیوں نہ ہوں اسی طرح وہ فساق و فجار سے رابطہ قلبی بھی نہیں رکھ سکتا خواہ وہ اس کے یگانے ہی کیوں نہ ہوں۔ قرآن اس امکان کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہے۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ يُوَادُّونَ مَنْ حَادَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَلَوْ كَانُوا آبَاءَهُمْ أَوْ أَبْنَاءَهُمْ أَوْ إِخْوَانَهُمْ أَوْ عَشِيرَتَهُمْ (مجادلہ۔۳)

تم کسی ایسے گروہ کو جو اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو ان لوگوں سے الفت و مودت کا رشتہ رکھتا ہوا نہ پاؤ گے جو اللہ اور اس کے رسول کی عداوت اور مخالفت پر کمربستہ ہوں، خواہ وہ ان کے اپنے ہی باپ، بیٹے یا بھائی یا اہل خاندان ہی کیوں نہ ہوں۔

غرض ایک اصول اور نصب العین کی علمبردار پارٹی جس طرح اپنے ارکان کو ڈسپلن کی سخت بندشوں میں باندھکر رکھتی ہے اُسی طرح قرآن نے مداہنت کے تمام رشتوں کو کاٹ کر ایک مرکز سے جُڑ جانے کا مطالبہ کیا ہے۔ چنانچہ یہی بات اس نے اتحاد و اختلاف کی نمائش کے ساتھ بھی واضح کر دی ہے اور کھلے لفظوں میں فرما دیا ہے کہ خبردار ان بدبخت لوگوں کی روش نہ اختیار کرنا جو "بینٰت" الٰہی کے انوار رکھتے ہوئے بھی افتراق و تشتت کی تاریکیوں میں کھو گئے۔ (وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ)

(۳) امر بالمعروف و نہی عن المنکر

اقامتِ دین کے پروگرام کی تیسری دفعہ وَلْتَكُنْ مِنْكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ کے ارشادِ الٰہی میں واضح کی گئی ہے جس کی تفصیل یہ ہے کہ انفرادی طور پر اپنی اپنی ذات کے اوپر دینِ حق قائم کرنے اور پھر ایسے تمام افراد کا باہم جڑ کر ایک جماعت بننے کے ساتھ ساتھ "اس "خیر و معروف" کی طرف دوسروں کو بھی بلایا جائے جس کو خود بھی قبول کیا گیا ہے اور اس منکر کو حسبِ استطاعت اور حسبِ موقع کہیں بزورِ شمشیر کہیں بذریعہ زبان، اور کہیں بواسطہ استنکارِ قلب، مٹا ڈالنے کی مسلسل سعی جاری رکھی جائے جس کو خود ترک کیا گیا ہے، یہاں تک کہ خدا کی زمین کے کسی گوشہ میں اس کے دین کے سوا کسی اور دین کا اثر و اقتدار باقی نہ رہ جائے جس طرح

اقامت دین کی دوسری دفعہ یعنی افراد امت کا اجتماع و اتحاد، پہلی دفعہ یعنی
انفرادی صلاح و تقوی کا لازمی تقاضا ہے، اسی طرح یہ تیسری دفعہ یعنی امر
بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی اس کا عین مقتضائے فطرت ہے۔ نہ کہ کوئی
خارجی اور غیر متعلق اور مختلف المزاج حکم۔ محبت کا فطری مطالبہ ہی یہ ہے کہ
گرد و پیش انہی احوال و مناظر کی کارفرمائی ہو جو محبوب کو پسندِ خاطر ہوں،
وہ دل سوزِ محبت سے آشنا نہیں کہا جا سکتا جو محبوب کی مرضی کو پامال ہوتا
ہوا دیکھے اور دیکھ کر سہا رہے، اور تڑپ نہ اٹھے۔ اس لیے خدا کی محبت اور حق
کی جاذبیت کہ روح تقوی عبارت ہے انہی چیزوں سے۔ ایک خدا پرست
اور متقی و مسلم کو چین سے بیٹھنے نہیں دے سکتی جب تک کہ صفحۂ ارض پر اس
کی نگاہوں میں کھٹکنے کے لیے ایک باطل اور ایک منکر بھی موجود ہو۔ اس کے
اسلام اور ایمان کے یہ شے منافی ہے کہ کسی شخص یا گروہ یا ملک کو وہ دین
الٰہی کے حلقۂ انقیاد سے آزاد اور طاغوت کا فرماں بردار دیکھے اور ٹھنڈے
دل سے اسے برداشت کرلے۔ پس اقامت دین کا فرض ادا نہیں ہو سکتا،
جب تک کہ پیروان دین حنیف کی جمعیت امر بالمعروف کے فرض کو سر انجام
نہ دے رہی ہو، اور اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ
مُّسْلِمُوْنَ کی منزل طے نہیں ہو سکتی۔ اگر اہل ایمان خود اتباع احکام الٰہی
کرنے پر ہی اکتفا کرلیں، اور ان کو اس سے کوئی بحث نہ ہو کہ باقی دنیا کدھر
جا رہی ہے۔

اس اقتضائے ایمانی کے علاوہ امر بالمعروف کی ایک خالص سیاسی

ضرورت بھی ہے۔ فطرت کا یہ ایک اٹل قانون ہے کہ وہی زندہ رہتا ہے جو اقدام کی عملی جرأت رکھتا ہو۔ بقا اور ارتقا صرف جارحانہ پیش قدمی میں ہے۔ زبردست سے زبردست لشکر بھی اپنے آپ کو شکست کی ذلت سے نہیں بچا سکتا، اگر وہ دشمن کے خلاف جارحانہ حملے کرنا نہ جانتا ہو۔ کوئی تحریک زوال و انحطاط کے انجام سے دوچار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی اگر وہ اپنی داخلی تعمیر و تنظیم کے ساتھ ساتھ اپنے بیرونی ماحول کی تسخیر کی مہم سے غافل ہو۔ اسی طرح وہ جماعت جو اللہ کے دین کی علمبردار ہو، اس وقت تک زندگی اور پائندگی کی مستحق نہیں ہو سکتی، نہ ہی اس کے اپنے اندر دین کا قیام باقی اور مستحکم رہ سکتا ہے جب تک کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے اسلحوں سے طاغوتی مورچوں پر مسلسل جارحانہ حملے نہ کرتی رہے۔ جس طرح ایک جاندار کا جسم محنت و مشقت کے بعد اپنے بعض اجزاء کے تحلیل ہو جانے کی وجہ سے کمزور ہوتا رہتا ہے۔ اور اس کمزوری کو دور کرنے اور اصل طاقت عزیزی کو بحال رکھنے کے لیے غذاؤں کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ جسم کی رگوں میں تازہ خون پہنچا کر اس کی زائل شدہ قوت کو واپس لاتی رہیں، اسی طرح اقامت دین کا نصب العین رکھنے والی جماعت کی قوت خیر و تقویٰ کو بقا و استحکام اور فروغ و نشو و نما دینے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی رگوں میں امر بالمعروف کے ذریعہ خدا پرستی کا خون تازہ بتازہ داخل کیا جاتا رہے، ورنہ رفتہ رفتہ اس میں روح تقویٰ مضمحل ہوتی جائے گی، اور خود اس کے اوپر سے دین کا اقتدار ڈھیلا ہوتا جائے گا۔ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ کائنات طبعاً

متحرک پیدا کی گئی ہے، سکون و جمود سے اس کی فطرت نا آشنا ہے، اگر اس کو آگے کی طرف بڑھنے کا موقع نہ ملے گا تو یقیناً پیچھے ہٹنے لگے گی۔ کوئی شئے کسی ایک حالت پر جم کر نہیں رہ سکتی، ضرور ہے کہ کسی نہ کسی سمت حرکت کرتی رہے، اس لیے قیام دین کی تحریک اگر آگے نہ بڑھے گی تو پیچھے ہٹنا شروع کر دے گی۔ جب آیت اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ نازل ہوئی تو حضرت عمرؓ رو پڑے، آنحضرتؐ نے رونے کی وجہ پوچھی تو کہا "آج تک ہمارا دین ترقی کے زینے طے کرتا رہا لیکن اب جب کہ وہ اپنی حد کمال کو پہونچ گیا ہے، اس کے انحطاط کا آغاز ہو گا۔ کیونکہ جو شئے بھی کامل ہو جاتی ہے وہ ناقص ہو کر رہتی ہے۔" آنحضرتؐ نے فرمایا "بیشک! تم نے بہت صحیح بات کہی"۔ بس نہ صرف اس لیے کہ فریضۂ اقامت دین کا امر بالمعروف ایک لازمی عنصر ہے، بلکہ اس لئے بھی کہ یہی امر بالمعروف اسلامی جماعت کے جوہر ایمان و اتقاء کا محافظ ہے، اس کو اس فرض کی ادائگی سے کوئی چارہ کار نہیں۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ | قرآن مجید نے اقامت دین کے یہ تین نکات پیش کئے ہیں، اس لیے اس فرض کو ادا نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ ان تینوں نکات پر پورے عزم و استقلال کے ساتھ عمل نہ کیا جائے۔ لیکن اس سلسلہ میں یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہئیے کہ ان میں کوئی اس قسم کی زمانی ترتیب ہے کہ جب پہلے نکتہ پر کامل طور سے عمل ہو لے تب دوسرے کی بسم اللہ کی جائے، اور جب دوسرے کا کمال اتباع معرض وجود میں آلے تو تیسرے کو سامنے لایا جائے

اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ ان تینوں نکات پر بیک وقت عمل شروع
ہو جانا چاہیے اور اس سے پہلے اگر کسی چیز کی ضرورت ہے تو صرف ایک
چیز کی ہے یعنی ذہن کی پوری یکسوئی اور قلب کی سچی شہادت کے ساتھ
لا الٰہ الا اللہ اور محمد الرسول اللہ پر ایمان لانا۔ اس اقرار و اعتراف
کے بعد جب ایک شخص یا ایھا الذین آمنوا کے زمرۂ مخاطبین میں
آگیا تو قرآن بیک وقت اس کے سامنے یہ تینوں مطالبے رکھ دیتا ہے اور
اس کے لیے اپنے حالات اور اپنی استطاعت کے مطابق ان تینوں
نکات پر ایک ساتھ عمل کرنا لازمی ہو جاتا ہے۔ کیونکہ ان تینوں نکات میں
عمل کے لحاظ سے تفریق کرنا سرے سے ممکن ہی نہیں، اور حقیقت تو یوں ہے
کہ دوسرے اور تیسرے نکتے بھی پہلے ہی نکتہ کے اجزا یا یوں کہیے کہ اسی کے
تکملات ہیں نہ کہ اس سے علیحدہ مستقل بالذات نکتے۔ اس طرح دوسرے اور
تیسرے نکتوں پر عمل پیرا ہونا دراصل پہلے ہی نکتہ کے اتباع کی تکمیل ہے۔ اور
جب تک ان دونوں پر عمل نہ ہو لے .... پہلے پر عمل کا
حق ادا نہیں ہو سکتا کیونکہ جب تک کسی کل کے تمام اجزاء موجود نہ ہو لیں
وہ کل اپنی کامل شکل میں وجود پذیر ہو ہی نہیں سکتا۔

اس دعویٰ کی صحت معلوم کرنے کے لیے کسی بڑی بحث و تمحیص کی ضرورت
نہیں بجز اس کے کہ تقویٰ کے صحیح مفہوم کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے۔ ہم
اوپر بتا چکے ہیں کہ تقویٰ ان تمام حدود کی ٹھیک ٹھیک پابندی کا نام ہے جو اللہ
اور اس کے رسول نے میدان زندگی کے ہر چہار اطراف میں قائم کر دی ہیں اور

آدمی اُس وقت تک متقی نہیں بن سکتا جب تک کہ وہ اپنی زندگی کے تمام مسائل و معاملات میں ـــ خواہ ان کا تعلق اس کے اپنے نفس اور اپنی انفرادی زندگی سے ہو، خواہ منزلی اور معاشرتی زندگی سے، خواہ سیاسی اور اجتماعی زندگی سے ـــ غرض ہر جگہ اور ہر معاملہ میں اللہ تعالیٰ کے نازل کیے ہوئے احکام کا اتباع اور اس کی قائم کی ہوئی حدود کی حفاظت اور نگرانی نہ کرے۔ اس حقیقت کے سمجھ لینے کے بعد اس امر سے انکار کرنا کہ اقامت دین کے باقی دو نکات دراصل پہلے ہی نکتہ کے مقتضیات اور تکملات ہیں، ایسا ہی ہے جیسے کوئی ۲ اور ۲ کے چار ہونے سے انکار کر دے۔ کیونکہ اپنے نصب العین زندگی کی خاطر تمام اہل ایمان کا باہم متحد ہونا اور امر بالمعروف میں اشتغال دائمی رکھنا بھی تو منجملہ انہی احکام و حدود کے ہے جن کی پابندی کا نام تقویٰ ہے۔ قرآن کی ان آیتوں کو غور سے پڑھیئے:ـــ

(۱) يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَكُونُوا مَعَ الصَّادِقِينَ (توبہ) — اے ایمان لانے والو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور راست بازوں کے ساتھ رہو۔

(۲) إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ أَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ (حجرات۔ ۱) — مسلمان تو آپس میں بھائی بھائی ہیں، سو اپنے دو بھائیوں کے درمیان (اختلاف و عناد پیدا ہونے کی صورت میں) صلح کرا دو اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو تاکہ اس کی رحمت سے سرفراز ہو سکو۔

(۳) ...... وَاتَّقُوهُ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ مِنَ الَّذِينَ — ...... اللہ کا تقویٰ اختیار کرو، نماز قائم کرو اور مشرکوں میں سے نہ ہو، یعنی ان لوگوں میں سے

فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (روم ۳۲)

جنھوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور مختلف ٹولیوں میں بٹ کر رہ گئے اور اب ہر کوئی اپنے اپنے خیالات وافکار میں مست ہے۔

ان میں سے پہلی آیت میں سچے مومنوں سے جڑ کر رہنے کو اور دوسری میں دو باہم پھٹے ہوئے مومن دلوں کے دوبارہ جوڑ دینے کو "الفا" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور تیسری آیت میں اس رشتۂ اخوت و یگانگت کے فقدان کو بالکل شرک کا مظہر قرار دے کر اس حقیقت کے چہرے سے آخری حجاب بھی دور کر دیا گیا ہے۔ کہ ایمان و تقویٰ کے تحقق کے لیئے جماعتی اتحاد و مرکزیت شرط لازم ہے اس اصل دینی کی پوری وضاحت اور اہمیت دیکھنی ہو تو ان آیات کے ساتھ ان احادیث کو بھی سامنے رکھ لینا چاہیئے جن میں جماعت کے لزوم پر کفر و ایمان تک کا فیصلہ کر دیا گیا ہے۔ اور صاف طور سے بتا دیا گیا ہے کہ اس جماعت مومنین سے، جو "الجماعۃ" ہے اور جو صحیح معنوں میں دین حق کی علمبردار اور رسول کے مشن کی حامل اور اصحاب رسول کے نقوش قدم کی پیرو ہے، الگ ہونے والا دائرۂ اسلام سے خارج، اس کی زندگی کا قرانہ، اس کی موت جاہلیت کی موت، اور اس کا انجام آگ کا انجام ہے۔ اس کے بعد چند دوسرے نصوص ملاحظہ ہوں جن میں امر بالمعروف کو تقویٰ کا کام قرار دیا گیا ہے:-

... يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ

یہ لوگ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں معروف کا حکم دیتے ہیں منکر سے روکتے ہیں

عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ ...... وَاللّٰهُ عَلِيمٌ بِالْمُتَّقِينَ (آل عمران ۱۱۴)

اور بھلائی کے کاموں میں پوری سرگرمی سے حصہ لیتے ہیں .... اور اللہ متقیوں سے واقف ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قَاتِلُوا الَّذِينَ يَلُونَكُمْ مِنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوا فِيكُمْ غِلْظَةً وَاعْلَمُوا أَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ۔ (توبہ - ۱۲۳)

اے ایمان لانے والو! ان کافروں سے لڑو جو تمہارے قریب ہیں اور چاہیے کہ وہ تمہارے اندر درشتی محسوس کریں، یاد رکھو اللہ متقیوں کے ساتھ ہے۔

پہلی آیت میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو صفات متقین اور اوامر تقویٰ میں شمار کیا گیا ہے اور دوسری میں نہی عن المنکر کی ایک خاص شکل یعنی قتال کفار کو تقویٰ سے موسوم کیا گیا ہے۔

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (توبہ - ۹)

اور مومن مرد اور مومن عورتیں سب آپس میں ایک دوسرے کے "ولی" ہیں نیکی کا حکم دیتے ہیں اور بدی سے روکتے ہیں۔

اس آیت نے دونوں چیزوں کو اجزائے ایمان کے تحت ایک ہی ساتھ جمع کر دیا ہے، اور باہم جڑ کر ایک منظم پارٹی کی طرح رہنا اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کرنا مومنین کا نشانِ امتیاز اور مقتضائے ایمان قرار دیا ہے۔

ان آیات کی روشنی میں اس وہم کی تائید کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی، کہ جب تک اقامتِ دین کے پہلے نکتہ پر پورا پورا عمل نہ ہولے اور انسان کا باطن نورِ تقویٰ سے بخوبی منور نہ ہولے اس وقت تک اس

کے لیے دوسرے اور تیسرے نکات کی طرف توجہ کرنے کی اجازت نہیں
درحقیقت یہ وہم ایک زبردست حجاب ہے جو ہمارے نیکوکار افراد کی بصیرتوں
پر پڑا ہوا ہے جس کا ظاہری پہلو یقیناً بڑا ہی جاذب نظر اور روحانیت نواز
دکھائی دیتا ہے، مگر اس کا باطن اوہام باطلہ اور فریب جہل سے یکسر مملو
ہے. جب ایک شخص متقی اسی وقت ہو سکتا ہے جب وہ دیگر اہل
ایمان سے اتحاد و ولایت کا رشتہ جوڑ لے اور بقدر امکان امر بالمعروف
کے فرائض سرانجام دیتا رہے تو یہ بات کتنی لایعنی ہو گی کہ آدمی پہلے متقی
کامل بن لے تو "اعتصام بحبل اللہ جمیعاً" اور "امر بالمعروف" کی مہم کا
آغاز کرے۔ ان تینوں نکات کی مثال تو بالکل ایک درخت کے اجزاء
کی سی ہے جس طرح بیج سے ننھا سا پودا اُگتے ہی اس میں جڑ، تنہ اور
پتے کی تخلیق ہو جاتی ہے، اور تینوں ایک ساتھ نشو و ارتقا حاصل کرتے
ہیں. ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ بیج سے جڑ نکل کر خوب موٹی تازی ہو لے تب
اس میں سے تنہ نکلے، اور جب تنہ اپنی پوری بالیدگی کی حد کو پہونچ لے
تو اس میں سے پتیاں نکلنی شروع ہوں - اسی طرح نفس انسانی میں
طہارت اور روح تقویٰ کا وجود اس امر کو مستلزم ہے کہ اس میں سے
اتحاد امت اور امر بالمعروف کی مساعی کا ظہور ہو.

قرآن کے طریقۂ نزول سے ہمنوائی

اقامت دین کا یہی وہ طریقہ کار ہے اور اس کے یہی وہ اصول نکات ہیں جو قرآن حکیم کی حکیمانہ ترتیب نزول سے بھی مستنبط ہوتے ہیں. سب سے پہلے جو آیتیں اور سورتیں نازل ہوئیں اُن میں

صرف دو چیزوں کی تعلیم تھی، ایک تو ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت وغیرہ کی تعلیم، دوسری اقامتِ صلوٰۃ اور محاسنِ اخلاق کی تعلیم۔ جس طرح ایک کسان اپنی زمین میں مہینوں ہل چلاتا رہتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ بیج کو روئیدگی بخشنے کے لئے بالکل تیار ہو جاتی ہے تو اس وقت وہ جو بیج بھی اس میں ڈالتا ہے، فوراً اُگ آتا ہے۔ اسی طرح تیرہ برس کی طویل مدت تک اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو صرف ایمان کی، اور ذکر و نماز اور اسی طرح کے چند بنیادی اُمور کی تعلیم و تلقین کرتا رہا چنانچہ بالکل ابتدائی سورتوں مثلاً سورۂ مزمل، سورۂ مدثر وغیرہ کو پڑھیئے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس بارِ عظیم کے اُٹھانے کے لیے، جو پیغمبر اور اس کے حواریوں پر ڈالا جانے والا تھا، کس طرح ایمان کو دلوں میں اتارنے کے ساتھ ساتھ نماز اور ذکرِ الٰہی، صبر اور توکل اور انابت و خشیت کی تاکید کی گئی ہے۔ یہ اس لیے تاکہ دل اس بوجھ کو سہارنے کے لیے تیار ہو جائیں جو آگے چل کر ان پر پڑنے والا ہے، اور اطاعت و انقیاد کے لئے اس حد تک آمادہ ہو جائیں کہ جس وقت جو حکم بھی اوپر سے آئے بلا چون و چرا اُس کی تعمیل کے لئے اپنی جان و مال حاضر کر دیں۔ اور شہادت و اقامتِ دینِ حق کا جو فرض ان پر عائد کیا جانے والا ہے اس کو ادا کرنے کے لئے مستعد ہو جائیں۔ جب انفرادی حیثیت سے یہ تزکیہ قابلِ اطمینان حد تک پہونچ چکا تو زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق حدود و احکام کا نزول شروع ہوا اور وہ سورتیں نازل ہونے لگیں

جن میں ایک منظم پارٹی کی حیثیت سے مسلمانوں کے سامنے رکھکر ہدایتیں
دی گئی تھیں۔ اسی ضمن میں وہ احکام بھی آ گئے جو تمام اہل ایمان
کو ایک جماعت بن کر رہنے کی ہدایت پر مشتمل تھے؛ اور وہ احکام بھی
جو ایک جماعت کی تطہیر و تحسین کی ہدایات سے متعلق تھے۔ مدنی سورتوں
کو پڑھیئے تو یہ حقیقت پوری وضاحت کے ساتھ سامنے آ جائے گی۔ پھر
امر بالمعروف کا حکم بھی حالات کے لحاظ سے ایک خاص ترتیب کے
ساتھ نازل ہوتا رہا۔ مکہ کی زندگی میں یہ حکم زبانی دعوت و تبلیغ و ارشاد
تک محدود رہا۔ مدینہ میں زبان کے ساتھ ساتھ ہاتھ سے بھی کام لینے
کی تاکید کی گئی۔ لیکن ایک عرصہ تک حالات کے لحاظ سے یہ کام صرف
مدافعت کی حد تک محدود رہا۔ پھر فتح مکہ کے بعد جب عرب میں کفر نے
سپر ڈال دی، اور مسلمانوں کو اطمینان اور بے خوفی کی فضا میسر ہوئی
اور وہ ایک بالادست قوت کی حیثیت میں ہو گئے، تو تمام کفار و مشرکین
سے برأت کا اعلان کر کے دفاع و اقدام سے بدل گیا اور قاتلوهم حتی
لا تكون فتنة ويكون الدين لله فرمایا۔ اس وقت تک کے لئے
اہل ایمان کو امر بالمعروف یعنی حق کی اشاعت اور اقامت کا ذمہ دار
بنا دیا گیا جب تک کہ یہ دنیا باقی ہے اور اس میں حق سے باطل
معروف سے منکر، ایمان سے کفر اور دین الٰہی سے دین طاغوت سے
نبرد آزمائی کے لئے موجود ہے۔

اسوۂ رسول | اقامت دین کا یہ طریق کار اور اس کے یہ اصول و مناہج

تو ہمیں قرآن سے حاصل ہوتے ہیں۔ اب اگر آپ معلم قرآن صلے اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ مبارک پر نظر ڈالیں تو دیکھیں گے کہ وہی اصول و نکات جو قرآن کے اندر الفاظ کے جامہ میں تھے، یہاں واقعات اور تجربات کی شکل میں موجود ہیں۔ اور نبی اکرم نے ٹھیک انہی لائنوں پر امت مسلمہ کی تاسیس اور تربیت و تنظیم کی۔ سب سے پہلے تو آپ نے عرب کے اس کفر زار میں، جس کا چپہ چپہ دین طاغوت کی آہنی گرفت میں جکڑا ہوا تھا۔ ایک آواز بلند کی، جس کا مفہوم یہ تھا کہ انسان اپنے تمام جذبات و میلانات اور اپنی زندگی کے تمام مسائل و معاملات کو اس ذات واحد کے تابع فرمان بنا دے، جس کے سوا اس زمین پر کسی کو اپنی مرضی منوانے اور اپنا حکم چلانے کا استحقاق نہیں۔ یہ نامانوس آواز جن بہرے کانوں سے سنی گئی اور اس کو دبانے کے لیے جن انسانیت سوز مظالم سے کام لیا گیا ان سے کوئی صاحب نظر ناواقف نہیں ہے۔ سیاسی حالات نے آنکھیں دکھائیں، وطنی مفادات آڑے آنے کی کوشش کی، وقت اور ماحول نے ساتھ دینے سے انکار کیا، مصلحتوں نے دامن پکڑا، مشکلات نے راستہ روکا، ہلاکتوں کا طوفان نمودار ہوا، مگر اللہ کے اس بندہ نے اپنی آواز میں کبھی کوئی پستی نہیں آنے دی، اور حالات زمانہ، رفتار واقعات اور مستقبل کے امکانی خدشات غرض ہر طرف سے آنکھیں بند کر کے اس حقیقت کو دوسروں پر ظاہر کرتا رہا جو خود اس پر کھل چکی تھی، اور باوجود اس کے کہ وہ اپنے عقیدۂ توحید

اور نظریۂ زندگی میں تن تنہا تھا۔ اس نے ایک لمحہ کے لئے بھی یہ گوارا نہیں کیا کہ اس عقیدہ اور نظریہ کو چھپائے رکھے، اگرچہ پوری دنیا اس کی زباں بندی پر کمربستہ تھی۔ بالآخر اس دعوت حق نے دلوں کو مسخر کرنا شروع کیا، اور ان لوگوں میں سے جن کے اندر قبول حق کی صلاحیتیں ابھی زندہ تھیں، ایک ایک دو دو کر کے آپ کے حلقۂ اطاعت میں آنے لگے۔ آپ نے ان کے قلوب و اذہان میں ایک خدا کی غلامی اور پرستش کا گہرا نقش بٹھایا، اور اصولی طور پر ان کو یہ بات سمجھا دی کہ دعا صرف اس کی چاہو جس نے تمہیں زندگی اور سامانِ زندگی عطا کیا، اور حکم صرف اس کا مانو جس کے سوا سب تمہاری ہی طرح عاجز و درماندہ ہیں۔ یہ نقش بٹھانے کے بعد ان کو زندگی کے احوال و مسائل میں بتدریج وہ احکام سنانے شروع کئے جو احکم الحاکمین کی طرف سے آپ پر نازل ہوتے رہے، اور ہر حکم پر خود عمل کرتے ہوئے ان کو اس پر عمل کرنے کی تعلیم دی۔ جاہلیت کی کتنا فتنوں سے ان کے باطن پاک کر کے ان میں مکارم اخلاق کی تخم ریزی کی، اور اپنی بے مثال قوت تربیت سے ان کے دلوں کو ایک خدا کی بندگی کا ایسا عقیدت کیش بنایا کہ اعدائے توحید نے اپنے ترکش ظلم و انتقام کے سارے تیر خالی کر دیئے، مگر کسی بندۂ مومن کا دل توحید کے نشے سے خالی نہ کر سکے۔ اس تربیت اور تزکیہ کے ساتھ ساتھ آپ ان سب لوگوں کو، جو آپ کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے حلقۂ اسلام میں داخل ہوتے جا رہے تھے،

ایک خاندان کے افراد کی طرح باہم جڑتے گئے۔ یہ جڑنا اتنا پائدار تھا کہ بھائی بھائی کے رشتے اس کے سامنے ماند پڑ گئے۔ پھر اسی کے ساتھ توحید کی دعوت و تبلیغ نہ صرف یہ کہ باقی رہی بلکہ اس کا دائرہ گھر سے خاندان، خاندان سے قبیلہ، قبیلہ سے شہر، اور شہر سے اطراف ملک تک وسیع ہوتا گیا۔ آنحضرت صلعم بھی اور آپ کے اتباع بھی، سب کے سب اس امر حق کی تبلیغ و اشاعت میں ہمہ دم مصروف رہتے، اور جس کسی کو شرک و کفر کی نجاستوں میں آلودہ پاتے اُسے پاک کر کے ایک خدا کا پرستار اور ایک آقا کا غلام اور ایک حاکم علی الاطلاق کا محکوم بنانے کی کوشش کرتے رہتے۔ جس بدی کو دیکھتے اس کو مٹانے کی تدبیر کرتے، اور کفر و فساد کے جس طوفان سے رحمت حق نے انھیں نجات دی تھی اُس میں دوسروں کو ڈوبتے دیکھنا انھوں نے کسی لمحہ بھی گوارا نہ کیا۔ یہ جد و جہد تیرہ برس تک مکہ میں جاری رہی، پھر وہ وقت آیا جب دشمنان حق کے لیے اس دعوت توحید کی مقبولیت اور روز افزوں ترقی ناقابل برداشت ہو گئی اور اُنھوں نے آنحضرت صلعم کے قتل کا انتظام کر کے اس دعوت کو فنا کر دینا چاہا تو داعی حق اور اس کے پیروان صدق کیش نے مکہ کو خیر باد کہہ کر مدینہ کو اپنے مشن کا مرکز بنایا، اور وہاں سے اس نصب العین کی خاطر جد و جہد شروع کر دی جس کو وہ اپنا مقصد زندگی بنا چکے تھے، اور جب کفار نے وہاں بھی چین نہ لینے دیا، اور ادھر اہل ایمان کی ایک منظم جمعیت بھی فراہم ہو چکی تھی تو بدی کے استیصال اور حق و عدل کی بقا کے لیے

تلوار اُٹھائی گئی ۔ ایک مدت تک تو طاغوتی طاقتیں خود بڑھ کر مدینہ پر
حملہ آور ہوتی رہیں اور مسلمان صرف مدافعت کرتے رہے۔ اس دوران
میں وہ خوف، دہشت، بے اطمینانی اور طرح طرح کے خطرات برداشت
کرتے رہے، اور جان و مال کی ہر ممکن قربانی کرکے حق کی شہادت دیتے
رہے، یہاں تک کہ حدودِ عرب میں کفر کی شوکت ٹوٹ گئی اور طاغوت
کا علم سرنگوں ہو گیا۔ اس وقت مسلمانوں کا قلب اس تائید و نصرتِ الٰہی
پر شکر و امتنان کے جذبات سے بھر تو گیا، مگر ان کی سواریوں کے کجاوے
اسی طرح بندھے کے بندھے رہے، اور اُن کی تلواریں اسی طرح کھنچی رہیں،
ان کے ہاتھ جو اب تک دفاع کے لئے اُٹھ رہے تھے، اب جارحانہ اقدام
کے لیے سرگرمِ کار ہو گئے۔ کیونکہ گو عرب میں بدی نے ہتھیار ڈال دیے تھے
مگر اس کے باہر ہر چہار طرف اس کی حکمرانی پوری شان کے ساتھ قائم تھی
اور مسلمان اپنے اس مشن کو بھول نہیں سکتا تھا کہ منکرات کو مٹا دینا چاہیے
جہاں کہیں بھی ہو۔ اور ہر غیر اللہ کی آقائی پامال ہو [illegible] چاہیے، خواہ
وہ کسی گوشۂ ارض پر ہو، یہ زمین خدا کی پیدا کی ہوئی [illegible] اس پر اسی
کا حکم چلنا چاہیے، اسی کے قانون کا اتباع ہونا چاہیے [illegible] کی مرضی
پوری ہونی چاہیے، اور اس "چاہیے" کی پوری ذمہ داری [illegible]
پر ہے۔ چنانچہ یہ ذمہ داری انھوں نے پورے احساسِ فرض کے ساتھ
ادا کی، اور جب تک وہ ایسا کرتے رہے، اللہ تعالیٰ کی موعود تائید
و نصرۃ اُن کے ہمرکاب رہی۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ سے باندھا ہوا

عہد اقامتِ دین فراموش ہونا شروع ہوا، اور دینِ حق کا چڑھتا ہوا سورج مسلمانوں کی قسمت کا ماتم کرتا ہوا زوال پذیر ہونے لگا۔ اور اب دوبارہ بامِ عروج پر آنے کے لئے اس مبارک صبح کا منتظر ہے جس میں حاملینِ قرآن عہد فراموشی کے خوابِ گراں سے بیدار ہو کر اپنے فرضِ منصبی کو از سرِ نو سنبھال لیں گے۔
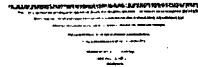
مطبوعات مکتبہ جماعت اسلامی حیدرآباد

۱	خطبات ۶ حصوں میں	۱۲ ؍
۲	تفہیمات	۱ ؍
۳	پردہ	۲ ؍
۴	سلامتی کا راستہ	۶ ؍
۵	اسلام کا نظریہ سیاسی	۷ ؍
۶	اسلامی حکومت کس طرح قائم ہوتی ہے	۷ ؍
۷	دین حق	۸ ؍
۸	نیا نظام تعلیم	۷ ؍
۹	شہادت حق	۷ ؍
۱۰	دستور جماعت اسلامی	۲ ؍
۱۱	دور عالم	۱ ؍
۱۲	معراج کی رات	۱ ؍
۱۳	لباس کا مسئلہ	۳ ؍
۱۴	قرآن فہمی کے بنیادی اصول	۳ ؍
۱۵	زندگی بعد موت	۲ ؍
۱۶	ہندستان میں تحریک اسلامی کا لائحہ عمل	۵ ؍
۱۷	ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک مجلد	۸ ؍

مکتبہ جماعت اسلامی ملے پلی جدید حیدرآباد دکن